إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ
(هود۔ ۸۸)

دعوت و اصلاح

کے چند

اہم اصول

قرآن و سنّت کی روشنی میں

از نعیم الحق نعیم

دار الدعوۃ السلفیۃ لاہور

ناشر
رضیہ شریف ٹرسٹ
۴۲۶- شادمان کالونی لاہور

فہرست مضامین

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دورِ حاضر میں مسلمانوں میں جو بے عملی، بد عملی بلکہ الحاد و بے دینی کا سلسلہ روز افزوں ہے، اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو قرآن و سنت میں اسے دی گئی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو لوگ کسی حد تک اس فریضے کو سر انجام دے رہے ہیں ان کی اکثریت اس کے صحیح اور مسنون طریقِ کار سے نا آشنا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ قرآن و سنت کی رو سے کون کون سے اخلاق و اوصاف اور کون کون سی صلاحیتیں اور خوبیاں ہیں جن کا ایک سچے داعی و مبلغ میں ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ آج دعوت و اصلاح کے نام پر اس کے صحیح طریقِ کار سے بے نیاز ہو کر جو کچھ کیا جا رہا ہے بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا نظر آتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر "دعوت و اصلاح کے چند اہم اصول" قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کسی حد تک مفید ہی ثابت ہو گی۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں دعوت و تبلیغ کی اہمیت، داعی و مبلغ کے اوصاف و اخلاق اور دعوت و تبلیغ کے صحیح طریقِ کار کے متعلق چند اصولی اور انتہائی بنیادی باتیں عرض کی گئی ہیں۔

دوسرا حصہ راقم الحروف کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو آج سے تقریباً دو تین سال قبل "نورستان" کے مجلّہ "تحریک خلافت" کے لئے بطورِ اداریہ لکھے گئے تھے۔

ان مضامین میں سے کچھ ایسے ہیں جو "دعوت و اصلاح" سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کا اس موضوع سے بالواسطہ تعلق ہے۔ چنانچہ ان مضامین کو ان کے اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کے لئے مفید بنائے!

وَصَلَّى اللهُ وَسَلَّمَ وَبَارَكَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ اَجْمَعِيْنَ - آمین -

نعیم الحق

۶ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

۱۱ جون ۱۹۸۹ء

حصّہ اول

دعوت و تبلیغ کی اہمیت و فضیلت

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ -

" (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ بلاؤ! اور ان سے ایسے طریقے سے مجادلہ و مباحثہ کرو جو انتہائی سلجھا ہوا اور خوبصورت ہو۔ " (النحل - ۱۲۵)

وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ وَلَاتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ -

"اور (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف بلاؤ! اور مشرکوں میں سے مت ہو جاؤ!" (القصص - ۸۷)

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْ اَدْعُوْا اِلَی اللهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحَانَ اللهِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ -

" (اے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام) کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ۔ میں علیٰ سبیل البصیرت اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور ہر وہ شخص جو میرا متبع ہے اور پاک ہے اللہ تعالیٰ۔ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ " (یوسف - ۱۰۸)

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.

"اور کون شخص گفتگو کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے اس شخص سے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ " (حم سجدۃ - ۳۳)

اندازہ کیجئے کہ دعوت و تبلیغ کا کام کس قدر عظمت و اہمیت کا حامل ہے کہ خود سیدالاولین و سیدالآخرین، افضل الانبیاء والمرسلین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ جو شخص بھی آپؐ کا

حقیقی متبع ہے وہ بھی یہ کام کرتا ہے۔ بلکہ یہ ضمانت دی جا رہی ہے کہ ایک داعی و مبلغ کی زبان سے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں نکلنے والے بول، کلمات اور جملے اللہ کی نگاہ میں دنیا بھر کے بولوں، کلمات اور جملوں سے بہتر اور خوبصورت ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهُ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهِ ۔

"جس نے بھلائی کے کام کی طرف کسی کی راہنمائی کی اس کو بھلائی کا کام کرنے والے کے برابر اجر و ثواب ملے گا۔" (صحیح مسلم)

گویا جو لوگ کسی داعی و مبلغ سے متاثر ہو کر راہِ راست پر آ جاتے ہیں ان سب کے نیک اعمال اس داعی و مبلغ کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوتے رہتے ہیں جس کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر انہوں نے نیکی کی زندگی اختیار کی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:۔

فَوَ اللّٰهِ لَاَنْ یَّهْدِیَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ ۔

"اللہ کی قسم! تمہارے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک شخص کو ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔"

چونکہ عربوں کی معاشرتی و معاشی زندگی میں سرخ اونٹوں کی بہت زیادہ اہمیت تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قدر و قیمت کے ساتھ مقابلہ کر کے دعوت و تبلیغ کی اہمیت و فضیلت اجاگر فرمائی ہے۔

اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجَاةِ ۔

"میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں۔" (غافر۔ ٤١)

یہ اس شخص کے الفاظ ہیں جو آل فرعون میں سے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام پر ایمان لے آنے کے بعد اپنی قوم کو تبلیغ کر رہا تھا۔ اس کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام لوگوں کو نجات دلانے اور دنیا و آخرت میں

اللہ کے عذاب سے بچانے کا کام ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ بلکہ پوری انسانیت کی خدمت اور بھلائی کا کام ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللهُ -

"اور سب مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔" (التوبہ۔ ۷۱)

اس آیتِ کریمہ سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کی باہم محبت و مودت اور ہمدردی و موالات کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔

اور دوسرے یہ کہ نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ان کاموں میں سے ایک ہے جن کی بنا پر انسان اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہو جاتا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ -

"وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (آل عمران۔ ۱۱۴)

اس آیتِ کریمہ میں ان اہلِ کتاب کا ذکر کیا گیا ہے جو حق پر قائم تھے۔ ان لوگوں کی دیگر خوبیوں کے ساتھ انکی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خوبی کو خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ -

"پس جب وہ اس چیز کو بھول گئے جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو

نجات دی جو برائی سے روکتے تھے۔ اور ظلم کرنے والوں کو سخت عذاب کی گرفت میں لے لیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔" (الاعراف۔ ۱۶۵)

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کے اس گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں ہفتے کے دن مچھلی کا شکار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا،مگر وہ حیلہ سازی سے اس حکم کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ہفتے کے دن مچھلیوں کی کثرت کی وجہ سے دریا کے کنارے پر کھودے ہوئے گڑھوں اور کھائیوں میں پانی کو مچھلیوں سمیت جمع کر لیتے اور اتوار کے دن جا کر وہاں سے مچھلیوں کو پکڑ لاتے۔

ان حیلہ سازوں کی اس روش کی وجہ سے اہلِ کتاب تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ تو ان حیلہ سازوں کا تھا جو برائی کا ارتکاب کیا کرتے تھے،دوسرا گروہ اس برائی سے روکنے والوں کا تھا۔ اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو نہ اس برائی کا ارتکاب کرتے تھے اور نہ اس سے روکتے تھے۔

اوپر کی آیت کریمہ میں برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے شدید عذاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ (یعنی ان کو بندر اور سُور بنا دیا گیا) اور برائی سے روکنے والوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ اور برائی سے منع نہ کرنے والوں کا چونکہ اس آیت میں صراحتاً ذکر نہیں ہے اس لئے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کردار کی وجہ سے اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ اور بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ بھی برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ ہی عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئے تھے۔ کیونکہ متذکرہ آیتِ کریمہ میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ ہم نے ظلم کرنے والوں کو سخت عذاب کی گرفت میں لے لیا۔ اور قدرت کے باوجود برائی سے نہ روکنا بھی ایک قسم کا ظلم ہی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ دوسری رائے زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوْ امُنْكَرًا فَلَمْ يُغَيِّرُوْهُ يُوْشِكُ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابِهٖ –

"لوگ برائی کو دیکھ کر اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب نازل کر دے (جو برائی کرنے والوں اور اس سے منع نہ کرنے والوں دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے)" (ترمذی، ابن ماجہ)

عبداللہ بن مستورد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ فِى الْمَعَاصِىْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِىْ مَجَالِسِهِمْ وَ اَكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ فَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَاعَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ –

"جب بنی اسرائیل نافرمانی کے کاموں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے ان کو منع کیا، مگر وہ باز نہ آئے۔ پھر (بھی) وہ ان کی مجلسوں میں ان کے ساتھ بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان (علماء اور عوام) سب کے دلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا (یعنی عوام کے دلوں کی سیاہی علماء کے دلوں پر بھی اثر انداز ہونے لگی) پھر ان (سب) پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی زبانی لعنت کی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔" (ترمذی، ابو داؤد)

ان لوگوں کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کی قرآن مجید میں یوں وضاحت کی گئی ہے:۔

كَانُوْا لَايَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ – (المائدہ۔ ۷۹)

"کہ وہ لوگ جس برائی کو کرنے لگ جاتے تھے پھر ایک دوسرے کو اس سے منع نہیں کرتے تھے۔"

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو جو ملعون قرار دیا گیا تھا تو اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ان لوگوں نے اہلِ معصیت کو معصیت سے روکنے کا کام اور باہم دعوت و تبلیغ کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔ گویا اہلِ اسلام کو یہ تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ اس قسم کے طرزِ عمل سے احتراز کریں، ورنہ ان کو بھی بنی اسرائیل کے سے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔

دوسرے یہ کہ علماء اگر اہلِ معصیت کو معصیت سے باز رہنے کی تلقین و تبلیغ کریں اور وہ ارتکابِ معاصی سے باز نہ آئیں تو پھر علماء کو چاہیئے کہ وہ ان کی مجلسوں میں شرکت، ان کے ساتھ مل کر کھانے پینے اور بے تکلف اختلاط کا سلسلہ ختم کر دیں۔ ورنہ ان کی مصاحبت و مجالست ان پر بھی اثر انداز ہو گی۔ اور برائی کے متعلق ان کی نفرت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ اور ایک دن آئے گا جب وہ خود بھی اس برائی میں مبتلا ہو جائیں گے ___ گویا بُرائی کو نہ روکنا اور بُرے لوگوں کی صحبت و مجالست کا سلسلہ جاری رکھنا، برائی کو اپنے اوپر مسلّط ہو جانے کی دعوت یا اجازت دینے کے مترادف ہے۔

اس اصول کی تائید درجِ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَثَلُ الْمُدْهِنِ فِیْ حُدُوْدِ اللهِ وَالْوَاقِعِ فِیْهَا مَثَلُ قَوْمٍ اسْتَهَمُوْا سَفِیْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِیْ اَسْفَلِهَا وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِیْ اَعْلَاهَا فَکَانَ الَّذِیْ فِیْ اَسْفَلِهَا یَمُرُّ بِالْمَاءِ عَلَی الَّذِیْنَ فِیْ اَعْلَاهَا فَتَاَذَّوْا بِهٖ فَاَخَذَ فَأْسًا فَجَعَلَ یَنْقُرُ اَسْفَلَ السَّفِیْنَةِ فَاَتَوْهُ فَقَالُوْا مَالَكَ قَالَ تَاَذَّیْتُمْ بِیْ وَلَابُدَّ لِیْ مِنَ الْمَاءِ فَاِنْ اَخَذُوْا عَلٰی یَدَیْهِ اَنْجَوْهُ وَ نَجَّوْا اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ تَرَكُوْهُ اَهْلَكُوْهُ وَاَهْلَكُوْا اَنْفُسَهُمْ ۔

"اللہ تعالیٰ کے منع کردہ امور میں مداہنت کرنے والے شخص اور ان کا ارتکاب کرنے والے شخص کی مثال یوں ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک بحری جہاز میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کی ۔ کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں ہو گئے اور کچھ اس کے اوپر کے حصے میں۔

پس ایک شخص جو اس کے نیچے کے حصے میں تھا اوپر والوں کے پاس سے پانی وغیرہ لے کر گزرتا رہا تو انہوں نے اس کی تکلیف محسوس کی (اور ناگواری کا اظہار کیا) چنانچہ اس نے کلہاڑا لیا اور جہاز کے نچلے حصے میں سوراخ کرنا شروع کر دیا. (تاکہ اپنی پانی کی ضرورت پوری کر سکے) پھر وہ سب اس کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تمہیں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تم نے میری (آمد و رفت کی وجہ سے) تکلیف محسوس کی تھی. حالانکہ پانی کے بغیر میرے لئے کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ (آپ نے فرمایا) اب اگر وہ اس کے ہاتھوں کو روک لیتے ہیں تو اس کو بھی بچالیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچالیں گے۔ اور اگر اسے (اس کی حالت پر) چھوڑ دیتے ہیں تو اسے بھی ہلاک کر ڈالیں گے اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کر ڈالیں گے۔" (صحیح بخاری)

گویا اسلامی معاشرہ بحری جہاز کی مانند ہے۔ اور اس میں برائی کا ارتکاب کرنا بحری جہاز کے نچلے حصے میں سوراخ کرنے کے برابر ہے۔ اور اس برائی کے خلاف جدوجہد ترک کر دینا ایسے ہے جیسے کسی جہاز کو غرق ہو جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

اس حدیث شریف سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی برائی کو دیکھ کر اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرنے والے لوگ بھی ایک دن اس برائی اور اس کے ہولناک نتائج کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

چنانچہ آج اگر ہم اپنی انفرادی، معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لیں تو قدم قدم پر ایسے مقام آتے ہیں جہاں ہمیں بادلِ ناخواستہ برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسان برائی کے ارتکاب پر مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس صورتِ حال کی اصل ذمہ داری اُس لاپروائی پر عائد ہوتی ہے جو دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں ہم مدتِ دراز سے روا رکھے ہوئے ہیں۔ اور جو ہمیں "گُربہ کُشتن روزِ اول" پر عمل پیرا نہیں ہونے دیتی۔

دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت

دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت حالات و افراد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی یہ فرضِ عین ہوتی ہے کبھی فرضِ کفایہ اور کبھی سنتِ مُؤکدہ۔

فرضِ عین

جب ہر طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہو. نیکی مغلوب اور برائی غالب ہو. برائیوں کا ارتکاب کرنے والے بے حدو بے شمار ہوں. اور برائی سے منع کرنے والے داعی و مبلغ انتہائی قلیل ہوں، تو ایسی صورت میں مسلمانانِ عالم کے ہر ہر فرد پر حسب استطاعت دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام فرض عین ہو جاتا ہے۔ یعنی جو مسلمان بھی اس فریضے کو حسب استطاعت ادا نہیں کرے گا، عنداللہ مجرم اور گناہگار تصور کیا جائے گا۔

حالات حاضرہ کے پیش نظر راقم کے خیال میں دعوت و تبلیغ ہر ہر مسلمان پر فرض عین ہو چکی ہے. کیونکہ جہالت اور برائی کا ہر سو غلبہ ہے۔ داعی و مبلغ انتہائی قلیل اور مغلوب ہیں، الحاد و دہریت کا سیلاب اُمڈ آیا ہے، اور بے دینی مسلمانوں تک کے گھروں پر دستک دے رہی ہے۔ بلکہ بہت سے مسلمان گھرانوں میں دندنا رہی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مسلمان ایسے علاقے میں رہتا ہو جہاں اس کے سوا دوسرا کوئی شخص بھی دعوت و تبلیغ کی اہلیت و صلاحیت نہ رکھتا ہو تو وہاں اُس مسلمان کے لئے بھی حسب استطاعت دعوت و تبلیغ کا کام فرضِ عین کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

فرض کفایہ

جب برائی کمزور ہو، برائی کے مرتکب معدودے چند اشخاص ہوں۔ نیک لوگوں کی کثرت اور اُن کا غلبہ ہو تو ایسی صورت میں دعوت و تبلیغ کا کام فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی چند لوگ اگر اس فریضے کو ادا کر دیں تو باقی سب مسلمان بھی اس سے سبکدوش ہو جائیں گے اور اگر ان میں سے ایک شخص بھی اس فریضے کو ادا نہیں کرتا تو سب کے سب گناہگار ہوں گے۔

سنتِ مؤکّدہ

دعوت و تبلیغ کے فرض کفایہ ہو جانے کی صورت میں جب کچھ لوگ اس کی ادائیگی کے لئے مختص اور مقرر ہو چکے ہوں۔ برائی کا سر کچل دینے کی قوت سے بہرہ ور ہوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو انتہائی مؤثر طریقے سے سر انجام دے رہے ہوں تو ایسے حالات میں عامۃ المسلمین کے لئے دعوت و تبلیغ میں شرکت کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ یعنی اگر وہ اس فریضے کی انجام دہی میں شریک ہو جاتے ہیں تو ان کے لئے بہت اجر و ثواب ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو عنداللہ گنہگار نہیں ہوں گے۔

دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل آیات واحادیث پر غور فرمائیے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ -

"تم تو بہترین امت تھے، جسے لوگوں کی خاطر معرض وجود میں لایا گیا۔ تم (تمام دنیا کے لوگوں کو) نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران - ۱۱۰)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا -

"اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی (افراط و تفریط سے مبرا) امت بنایا، تاکہ تم (تمام دنیا کے) لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔ اور رسول (علیہ الصلوٰۃ و السلام) تم پر گواہ ہو جائیں۔" (البقرہ۔ ۱۴۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام) پر یہ ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ تمام لوگوں کے لئے دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس کا فریضہ سرانجام دے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

"اور (اے مسلمانو!) تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو (عام مسلمانوں کو) بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے، اور یہی لوگ فلاح و کامرانی پانے والے ہیں۔" (آل عمران۔ ۱۰۴)

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۔

"پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان میں سے ہر (علاقے کی) جماعت سے ایک گروہ نکلتا تاکہ وہ لوگ دین کی تعلیم اور سمجھ حاصل کرتے، اور تاکہ جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹتے تو ان کو (اللہ کے عذاب یا جہالت کے نتائج سے) ڈراتے۔ شاید وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچ جاتے۔" (التوبہ۔ ۱۲۲)

ان آیاتِ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو مسلمانوں کے اندر دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور انذار (اللہ کے عذاب سے ڈرانے) کا کام کرتا ہو۔

○ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَن رَّأی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ -

"جو شخص تم میں سے کسی منکر (برائی) کو دیکھے اسے چاہئے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے. (یعنی مٹا دے) سو اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف بات کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے. (اس کو بُرا جانے) اور یہ (آخری صورت) ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (صحیح مسلم)

ختمِ نبوت اور دعوتِ دین کی ذمہ داری

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسانیت کی ہدایت و راہنمائی کے لئے جس سلسلۂ نبوت کا آغاز حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے کیا گیا تھا، اس کا اختتام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات پر کر دیا گیا ہے۔

اب اسلام میں نہ کسی نئی نبوت کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوت کے ختم ہو جانے سے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے؟ یا ختم ہو جانا چاہیئے؟ یا یوں کہنا چاہیئے کہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی (دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں) ذمہ داریاں کسی پر عائد ہوتی ہیں یا نہیں؟ اگر ہوتی ہیں تو کس پر؟

ہمارے خیال میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہر امتی پر عموماً اور ہر عالمِ دین پر خصوصاً عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس کی کامل ترین اور مؤثر ترین شکل یہ ہے کہ دین کی حکومت قائم کی جائے اور تمام مسلمان اپنا ایک خلیفہ منتخب کر کے خود کو نظامِ خلافت میں منسلک کر لیں۔ اور پھر خلیفۃ المسلمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں دنیا بھر کی غیر مسلم حکومتوں کو خط و کتابت اور جہاد و قتال کے ذریعے اللہ کے دین کی دعوت دے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

- اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ -

دونوں آیات کریمہ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

گویا عقیدۂ ختمِ نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ کسی اور نبیؑ کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس لئے نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ پوری امتِ مسلمہ پر

ڈال دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر فرد مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ اور اشاعتِ دین کا کام اسی طرح انتہائی محنت اور جان فشانی سے کرے، جس طرح خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کرتے رہے ہیں۔

ہمارا موجودہ رویہ

مگر آج مسلمانوں کی عام حالت یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ تو بہت دور کی بات ہے وہ اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے بلکہ اسلامی احکام کا علم حاصل کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ اور یہ بات واضح ہی ہے کہ دعوت و تبلیغ سے پہلے عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور عمل سے پہلے علم کی۔

بلکہ اپنے موجودہ طرزِ عمل سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی عیسائیوں کی طرح دین و دنیا کی تفریق کے قائل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دین و دنیا کے کاموں کی تقسیم کچھ اس طرح کر رکھی ہے کہ دین کا علم حاصل کرنا، اس پر عمل پیرا ہونا اور اس کی تبلیغ کرنا علمائے کرام کی ذمہ داری ہے اور تجارت، دکانداری، کلرکی، افسری، ڈاکٹری، انجینئرنگ، وزارت، حکومت غرض تمام کاروبار دنیا ہمارا فریضہ اور استحقاق ہے۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دنیا کے دیگر مذاہب و ادیان میں طبقاتی تقسیم ہو سکتی ہے، بلکہ ہے۔ لیکن دینِ حق (اسلام) میں اس قسم کی تقسیم کا قطعاً کوئی تصور نہیں کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ علماء کا ہو جو دین کے لئے وقف ہو۔ اور دوسرا طبقہ عوام کا ہو جو دنیا کے دھندے میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ اسلام کی نگاہ میں تمام مسلمانوں کا ایک ہی طبقہ ہے۔ سب کے سب مسلمان اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیم حاصل کریں، اس کے مطابق اپنی زندگیوں میں عملی تبدیلی پیدا کریں، اس کی تبلیغ و اشاعت میں کما حقہٗ دلچسپی لیں بلکہ اس کے لئے جہاد و قتال کی تیاری بھی کریں۔

حق وباطل سے تعلّق کے درجات

ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ باطل کے باطل کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے چار درجے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ باطل کے ساتھ علمی وابستگی رکھتے ہیں، لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے، بعض لوگ اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، لیکن دوسروں کو اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ بعض اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں، لیکن باطل کی خاطر کٹ مرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کی خاطر کٹ مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اسی طرح اہلِ حق کے بھی چار درجے ہوتے ہیں۔کچھ لوگ حق کا علم رکھتے ہیں، لیکن اس کے مطابق عمل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، لیکن اس کی تبلیغ میں کمزوری دکھاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں، لیکن اس کے لئے جہادو قتال کی جرأت نہیں کرتے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق کے لئے آمادۂ پیکار اور جہاد و قتال کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور وقت آنے پر جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔

دعوتِ دین کا خلاصہ

دعوت دین کا خلاصہ اور داعی حق کا اصل کام مختصراً یہ ہے کہ اہلِ باطل کو اہلِ حق کے پہلے درجے کی طرف آنے کی دعوت دے اور پہلے درجے کے اہلِ حق کو دوسرے درجے کی طرف، دوسرے درجے والوں کو تیسرے درجے کی طرف اور تیسرے درجے والوں کو چوتھے درجے کی طرف ترقی کرنے کی دعوت و ترغیب دے۔ اور پھر ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف انتقال و ترقی کے راستے میں اُن کو جو جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی تلقین کرتا رہے۔

دعوت وتبلیغ اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت

دعوت وتبلیغ کے لئے اخلاق حسنہ کی اہمیت پر چند گزارشات اور انتہائی بنیادی نکات پیش خدمت ہیں۔ ان کے بعد اصل مقصود پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

۱۔ ایک داعی دین کے لئے بہت ضروری ہے کہ میدان دعوت میں اترنے سے قبل امکانی حد تک اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کر چکا ہو. ورنہ اس کی دعوت وتبلیغ میں تاثیر نہیں ہوگی اور نہ وہ اس عظیم کام کا حق ہی ادا کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطور نبی مبعوث ہونے سے پہلے اہل مکہ میں سب سے زیادہ بلند اخلاق تھے ۔ چنانچہ پہلی مرتبہ فرشتے سے ہم کلام ہو کر انتہائی پریشانی کے عالم میں جب آپ گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے آپ کے اخلاقِ حسنہ کی بایں الفاظ شہادت دی:

اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ۔ (بخاری مع فتح الباری ج ۱ ص ۲۲)

بلکہ بعثت سے پہلے ہر نبیؑ کی اللہ کی طرف سے تکوینی طور پر خصوصی اخلاقی تربیت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں انہیں بطور نبی مبعوث کیا جاتا ہے۔

۲۔ اخلاقِ حسنہ سے متصف لوگ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کو بہت جلد قبول کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور دیگر بڑے بڑے صحابہؓ کی شخصیات بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ جب حضرت ابوبکرؓ اہل مکہ سے تنگ آکر کہیں جارہے تھے تو ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر ؓ کے اخلاقِ حسنہ کے متعلق تقریباً انہی الفاظ میں شہادت دی تھی جن الفاظ میں حضرت خدیجہ ؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دی تھی۔

(دیکھئے فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۰)

۳۔ چونکہ اخلاقِ حسنہ کی موجودگی انسان کو دعوتِ توحید قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے اس لئے توحید کی دعوت سے قبل یا اس کے ساتھ ساتھ اخلاقِ حسنہ کی تبلیغ کرنی چاہیئے تاکہ وہ دعوتِ توحید کے لئے تمہید کا کام دے اور اس کے لئے سامعین کے دلوں کی زمین کو ہموار اور ساز گار بنائے۔ اور ظاہر ہے کہ اخلاقِ حسنہ کی تبلیغ بھی وہی شخص کر سکتا ہے جس نے پہلے اپنے اخلاق درست کر لئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں دعوت توحید کے ساتھ ساتھ اخلاقی امور پر بھی بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ العلق، مدّثر، مزمّل، القلم اور دیگر مکّی سورتوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ابو سفیانؓ (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے ہرقل کے دربار میں اعتراف کیا تھا کہ وہ (نبیؐ) ہمیں اللہ وحدہٗ کی عبادت کرنے کا، شرک اور آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ دینے کا اور نماز، سچائی، عفت اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

سورۃ البلد کی آیت

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ الآية (سورة البلد ۔ ۱۱)

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآية (سورة البلد ۔ ۱۷)

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے لئے ایمان سے بھی پہلے اخلاقِ حسنہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اخلاق اور ایمان کے مابین جو وجودی ترتیب ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ الآية (الشورى ۔ ۵۲)

سے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ۔

ترجمہ:۔ "میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔" یعنی جس شخص میں

اخلاقِ حسنہ ناقص صورت میں پہلے ہی موجود ہیں، وہ اگر مجھ پر ایمان لے آئے اور پیغامِ توحید قبول کر لے تو اس کے اخلاقِ حسنہ تکمیلی شکل اختیار کرنا شروع کر دیں گے ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیگر انبیاءؑ کی طرح سب سے پہلے توحید ہی کی طرف دعوت دی تھی۔ اس لئے معلوم ہوا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل توحید کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح بعض احادیث میں ایمان کے حوالے سے حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے مثلاً۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔

اس سے معلوم ہوا کہ

ایمان وتوحید کی تکمیل حسنِ اخلاق کے بغیر ممکن نہیں۔ گویا توحید واخلاقِ حسنہ دونوں کی تکمیل ایک دوسرے پر موقوف ہے۔ موحّدین کو اس نکتے کی طرف خصوصی توجّہ دینی اور دلانی چاہئے۔

۵۔ کوئی بھی اچھی اور پاکیزہ چیز کسی اچھے اور پاک برتن ہی میں ڈالی جاتی ہے۔ اس لئے اخلاقِ رذیلہ کی گندگی سے محفوظ دلوں ہی میں عام طور پر ایمان ومعرفت اور محبتِ الٰہیّہ جیسی صاف ستھری اور پاکیزہ چیز ڈالی جاتی ہے۔

۶۔ دعوت وتبلیغ کے کام میں پیش آنے والے مصائب ومشکلات وہی لوگ برداشت کر سکتے ہیں جو اخلاقی طور پر مضبوط ہوں۔ اس اعتبار سے بھی داعی کو چاہئے کہ دعوت سے پہلے اخلاقی طور پر مضبوط ہو چکا ہو۔

۷۔ اسلام کے پھیلاؤ میں مسلمانوں کی بداخلاقی بہت بڑا مانع ہے۔ گویا بداخلاق داعی ومبلغ اپنی راہ میں آپ ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

۸۔ توحیدِ خالص کی دعوت مشرکین کے لئے بہت تلخ اور کڑوی ہوتی ہے، جسے سننا بھی ان کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔ داعی کے اخلاقِ حسنہ کی حلاوت اس کی دعوت کی تلخی کو کم اور سامعین کے لئے گوارا بنا دیتی ہے۔

۹۔ اخلاقِ حسنہ کے فروغ اور نشر واشاعت سے مسلمانوں کے اختلاف اور فرقہ

بندی کو بھی ختم یا کم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اپنے آپ کو غلط اور دوسرے کے صحیح ہونے کو تسلیم کرنے کے لئے اخلاقی جرأت ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۰۔ ہر مسلمان کسی نہ کسی حد تک مُبلّغ اور داعی ہوتا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ـ ١١٠)

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَا كُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرة ـ ١٤٣)

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ الخ

اس لئے ہر مسلمان کے لئے بلند اخلاق ہونا بہت ضروری ہے۔

۱۱۔ اسلامی حکومت کے قیام اور پھر اس کے دوام وبقاء کے لئے بھی تمام چھوٹے بڑے مسلمانوں کا اخلاقی طور پر انتہائی مضبوط اور تربیت یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اخلاقی طور پر کمزور افراد اور کارکن خرید لئے جاتے ہیں اور پھر جماعتوں، تحریکوں اور حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی ہے۔

۱۲۔ اگر ایک چھوٹی سی دکان بغیر اچھے اخلاق کے کامیابی کے ساتھ نہیں چلائی جا سکتی تو کوئی دینی ادارہ، درسگاہ، جماعت یا تحریک اخلاقِ حسنہ اپنائے بغیر کامیابی کے ساتھ کیسے چلائی جا سکتی ہے! اس لئے منتظمینِ مدارس اور قائدینِ اسلام کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کریں۔

۱۳۔ معاشرے میں علمائے کرام کے مقام کے گر جانے اور ان کے قیادت (لیڈر شپ) سے محروم ہو جانے کے متعدد اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ان کے اندر جذبۂ خدمتِ خلق کا مفقود ہو جانا ہے اور جذبۂ خدمتِ خلق اخلاقیات کی وسیع وعریض کتاب کا ایک چھوٹا سا باب ہے ــــ اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں بعثت سے قبل ہی یہ جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا ــــ

اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (صحیح بخاری وغیرہ)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر نقشہ

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ حقوق و فرائض:۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے متعلق جو فرائض عائد ہوتے ہیں ادا کرنے والے کی نسبت سے انہیں فرائض اور جس کے متعلق وہ ادا کئے جائیں اسکی نسبت سے انہیں حقوق کہا جاتا ہے۔ انہی حقوق و فرائض کو حقوق العباد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۔ آداب:۔ رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے اور نہانے دھونے سے متعلقہ مفید اصول وضوابط کو آداب کہا جاتا ہے۔ انہی آداب کی پابندی اور عدم پابندی سے انسان کے مہذب اور غیر مہذب ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

۳۔ فضائلِ اخلاق و رذائلِ اخلاق:۔ انسان کے ذاتی کردار کی اچھائیوں کو فضائلِ اخلاق اور برائیوں کو رذائلِ اخلاق کہا جاتا ہے۔ فضائل کو اپنانا ضروری ہوتا ہے اور رذائل سے بچنا۔

ایک سچے داعی اور مبلغ کے لئے بہت ضروری ہے کہ اخلاقی تعلیمات کی ان تینوں قسموں کی خود بھی پابندی کرے اور اپنے متعلقین سے بھی کرائے، تاکہ اس کے گردوپیش کا ماحول ایسا ہو کہ کوئی بھی ملنے والا اچھا تاثر لے کر جائے۔

ذیل میں ان حقوق، آداب اور فضائل و رذائل کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ تاکہ داعی وقتاً فوقتاً ان پر نظر ڈالتا رہے اور اس کی لوحِ ذہن پر ان کا نقشہ اچھی طرح قائم ہو جائے[1]۔

حقوق و فرائض ایک نظر میں

۱۔ حقوق الوالدین ۲۔ حقوق الاولاد ۳۔ حقوق الزوجین ۴۔ اہلِ قرابت کے حقوق ۵۔ ہمسایہ کے حقوق ۶۔ یتیموں کے حقوق ۷۔

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی مصنفہ سید سلیمان ندوی ج۶۔

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک ۸۔ حاجت مندوں کے حقوق ۹۔ بیمار کے حقوق ۱۰۔ غلاموں کے حقوق ۱۱۔ خادموں اور ملازموں کے حقوق ۱۲۔ مہمان کے حقوق ۱۳۔ عام مسلمانوں کے باہمی حقوق ۱۴۔ عام انسانوں کے حقوق ۱۵۔ جانوروں کے حقوق

آداب ایک نظر میں

۱۔ طہارت کے آداب ۲۔ کھانے پینے کے آداب ۳۔ مجلس کے آداب ۴۔ ملاقات کے آداب ۵۔ گفتگو کے آداب ۶۔ باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب ۷۔ آدابِ سفر ۸۔ سونے کے آداب ۹۔ آدابِ لباس ۱۰۔ خوشی کے آداب ۱۱۔ ماتم کے آداب۔

فضائلِ اخلاق ایک نظر میں

۱۔ صدق، سچائی، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی ۲۔ سخاوت ۳۔ عفت وپاکبازی ۴۔ دیانت وامانت ۵۔ شرم وحیاء ۶۔ رحم ۷۔ عدل وانصاف ۸۔ عہد کی پابندی ۹۔ احسان ۱۰۔ عفو ودرگزر ۱۱۔ حلم وبردباری ۱۲۔ رفق ولطف ۱۳۔ تواضع وخاکساری ۱۴۔ خوش کلامی ۱۵۔ ایثار وقربانی ۱۶۔ اعتدال ومیانہ روی ۱۷۔ خود داری وعزتِ نفس ۱۸۔ شجاعت وبہادری ۱۹۔ استقامت ۲۰۔ حق گوئی وبے باکی ۲۱۔ استغناء وبے نیازی

رذائلِ اخلاق ایک نظر میں

۱۔ کذب اور جھوٹ ۲۔ وعدہ خلافی ۳۔ خیانت وبددیانتی ۴۔ غداری ودغا بازی ۵۔ بہتان وافتراء ۶۔ چغل خوری ۷۔ غیبت اور بدگوئی ۸۔ دورخاپن ۹۔ بدگمانی ۱۰۔ مدّاحی اور خوشامد ۱۱۔

بخل ۱۲۔ حرص وطمع ۱۳۔ بے ایمانی ۱۴۔ چوری ۱۵۔ ناپ تول میں کمی بیشی ۱۶۔ چھپا کر لینا یا غلول ۱۷۔ رشوت ۱۸۔ سود خواری ۱۹۔ شراب خواری ۲۰۔ غیظ وغضب ۲۱۔ بغض وکینہ ۲۲۔ ظلم وزیادتی ۲۳۔ فخر وغرور اور کبر وتکبر ۲۴۔ ریاء کاری ۲۵۔ خود بینی وخود نمائی ۲۶۔ اسراف وتبذیر ۲۷۔ حسد ۲۸۔ فحش گوئی

اخلاقیات کے موضوع پر چند اہم کتب

۱۔ مکارمِ اخلاق (اردو) ۲۔ محاسنِ اخلاق (اردو) از مولوی ذکاء اللہ ۳۔ جوامع الآداب للقاسمیؒ (عربی) ۴۔ تہذیب الاخلاق للندویؒ (عربی) ۵۔ کیمیائے سعادت للغزالیؒ (اردو فارسی) ۶۔ اخلاقِ جلالی (فارسی) ۷۔ احیاء علوم الدین للغزالیؒ (عربی) ۸۔ مخزنِ اخلاق ۹۔ سیرۃ النبی ج۶ از سید سلیمان ندویؒ ۱۰۔ گلستانِ سعدی ۱۱۔ بوستانِ سعدیؒ (فارسی) ۱۲۔ پند نامہ (فارسی) ۱۳۔ کریما (فارسی) ۱۴۔ مداواۃ النفوس لابن حزمؒ (عربی)

دعوتِ دین یا غلبۂ دین؟

آج کل غلبۂ اسلام کے الفاظ اکثر پڑھنے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ اس تصور کی بنیاد پر کئی جماعتیں اور تحریکیں بھی برپا ہوتی رہی ہیں اور ہیں۔ لیکن راقم کے خیال میں ایک داعی و مبلغ کو اپنی تمامتر توجہ خالص دعوتِ دین اور اس کے صحیح طریقِ کار کے انتخاب اور پھر اس کے استعمال پر مرکوز رکھنی چاہیئے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہرگز نہیں کہ وہ اسلام کو ضرور غالب کر کے چھوڑے، خواہ اس میں اس کی طاقت ہو یا نہ ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ غلبہ اللہ کا کام ہے، ہمارا کام نہیں، ہمارا کام صرف دعوت ہے۔ اگر ہمارا دعوت کا کام اللہ کو پسند آگیا تو پھر وہ ہمیں غلبہ بھی عطا کر دے گا۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ (آل عمران ـ ۱۲۶)

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ (آل عمران ـ ۱۶۰)

نَصْرٌ مِّنَ اللهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ (الصف ـ ۱۳)

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر غلبہ کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا جائے تو پھر فطرتی اور نفسیاتی طور پر انسان کی توجہ اس کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے اور پھر دعوت کا کام بہت بری طرح متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کئی جماعتیں اور تحریکیں ہمارے ملک میں اس تجربے سے گزر چکی ہیں اور کئی گزر رہی ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غلبہ اگر پروگرام میں تو شامل ہو مگر عملاً جلدی اور تیزی سے حاصل نہ ہو پائے تو انسان بہت شدت کے ساتھ مایوسی کا شکار ہو کر اصل دین کی دعوت کا کام بھی ترک کر بیٹھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلبۂ دین کی خواہش اور شوق کوئی بری شے ہے، جس سے بچنا داعی کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ داعی کو چاہیئے کہ وہ غلبۂ دین کے شوق اور پروگرام کو اپنے اوپر یوں مسلط نہ کر لے کہ دین کی تعلیمات اور دعوتِ دین کے اصول و ضوابط کی پابندی اس سے متاثر یا مجروح ہو کر رہ جائے۔ ورنہ غلبۂ اسلام

کا شوق وولولہ فی نفسہ ایک زبردست محرک ہے جس نے تاریخِ اسلام میں ایسے ایسے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں جن پر بجاطور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

داعیؔ، دعوت، مدعوّ اور مدعوّ الیہ کے متعلق چند اصولی باتیں

۱۔ دعوتِ دین چونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے، اس لئے داعی کے اندر ان برگزیدہ ہستیوں کے اوصاف وعادات زیادہ سے زیادہ ہونے چاہئیں، جنہیں اخلاقِ حسنہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص داعی بننا چاہے، اسے سب سے پہلے پوری کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اخلاقِ حسنہ سے متّصف ہو۔ اگر وہ کسی درسگاہ میں زیرِ تعلیم ہے تو منتظمینِ درسگاہ کی ذمہ داری ہے کہ اس کی صحیح اخلاقی تربیت کریں۔ اگر منتظمین کی طرف سے ایسا بندوبست نہ کیا گیا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ خود اپنے اخلاق سنوارنے کی کوشش کرے، با اخلاق اساتذہ اور طلبہ سے زیادہ تعلق رکھے، اس موضوع پر لکھی گئیں کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرے۔ اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہے۔ مثلاً یہ دعا پڑھ سکتا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ وَاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَایَھْدِیْ لِاَحْسَنِہَا اِلَّا اَنْتَ وَقِنِیْ سَیِّءَ الْاَعْمَالِ وَسَیِّءَ الْاَخْلَاقِ لَایَقِیْ سَیِّئَہَا اِلَّا اَنْتَ۔

۲۔ داعی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ "مدعوّ الیہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا انتہائی مضبوط اور گہرا تعلق ہو۔ اس سلسلہ کی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں ابتدائی مکّی دور کی نازل شدہ سورتوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ مثلاً سورۃ العلق کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ (اے نبیؐ) سجدہ کر کے (اللہ کا) قرب حاصل کر! وَاسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (العلق ۔ ۱۹)

گویا سجدہ و نماز سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

حدیث میں بھی آتا ہے کہ انسان سجدے کی حالت میں سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا نماز اور سجدوں کی کثرت اور ان کے طول سے تقرب کے لمحات کو بھی طول دیا جا سکتا ہے، جو آہستہ آہستہ دوام میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

سورۃ المدثر کے آغاز میں پہلا حکم ہے کہ اٹھ کر لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤ! قُمْ فَاَنْذِرْ اور دوسرا حکم ہے کہ اپنے رب کی کبریائی کا اظہار واعلان کر دو[1]! وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اس کے بعد اپنے لباس اور اپنے کردار واخلاق کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے۔ اس کے بعد شرک کی آلودگیوں سے خود کو بچا کر رکھنے کا حکم ہے۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ - وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ -

اس کے بعد یہ حکم ہے کہ کسی پر احسان کرو تو بے غرض ہو کر کرو! وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ـــــــ اور آخر میں دعوت وتبلیغ کی راہ میں پیش آنے والی تکالیف ومشکلات پر اپنے رب کے لئے صبر کرنے کا حکم ہے۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ

اسی طرح سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں داعی کے لئے اس سلسلہ کی تقریباً مکمل راہنمائی دے دی گئی ہے۔ اس میں سب سے پہلا حکم "قیام اللیل" کا ہے۔ راقم کے خیال میں قیام اللیل، اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا قوی ترین سبب ہے، بشرطیکہ اس کے آداب وشروط کا خیال رکھا جائے۔ یعنی خلوصِ نیت، خشوع وخضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ لمبے لمبے سجدوں اور رکوع وقیام کا اہتمام کیا جائے۔ دوسرا حکم قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا ہے۔ قرآن کو ترتیل کے ساتھ۔ ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر غور وفکر کرتے ہوئے، پڑھنا بھی انسان کو اللہ کے قریب کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اور کلام سے تعلق پیدا ہو جائے تو صاحب کلام سے بھی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ تیسرا حکم اللہ کے نام کا ذکر کرنے کا ہے[2]۔ اللہ کے نام کے ذکر اور یاد کے دوام وکثرت سے خود اللہ کا ذکر اور یاد حاصل ہو جاتی ہے۔ جب اللہ کا ذکر ہر دم دل میں رہنے لگے تو پھر سمجھنا چاہئے کہ اللہ سے تعلق پیدا ہو گیا اور اس کا قرب

۱۔ اس حکم کی مفصل تشریح کے لئے دیکھئے اسی کتاب میں شامل مضمون "انسانی فکر وکردار کی اصلاح" "اللہ اکبر" کی روشنی میں

۲۔ اس کی تشریح کے لئے دیکھئے ہمارا مضمون "ذکر اللہ کی اہمیت، فضیلت اور فلسفہ"

کسی حد تک حاصل ہو گیا ہے۔ چوتھا حکم تبتّل کا ہے۔ یعنی تمام دنیوی علائق سے قلبی تعلق منقطع کر کے صرف اللہ تعالیٰ کا ہو رہنا۔ یہ گویا ایک قسم کی اندرونی، فکری، قلبی، نفسیاتی یا روحانی جدوجہد کا نام ہے، جس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پانچواں حکم اللہ کو اپنا وکیل بنا لینے کا ہے۔ یعنی اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ پر مکمل توکّل اور بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ بھروسہ اور اعتماد اسی پر کیا جاتا ہے، جس کے ساتھ پہلے کوئی قریبی تعلق قائم ہو چکا ہو۔ چھٹا حکم مخالفین کی دل آزار باتوں پر صبر کرنے کا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کسی کے ساتھ قرب اور محبت ومودّت کا تعلق پیدا ہو چکا ہو تو پھر اس کے راستے میں مصائب ومشکلات پیش آئیں تو انہیں برداشت کرنا اور صبر کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ ساتواں حکم یہ ہے کہ مخالفین کی باتیں سن کر ان کے پیچھے نہ پڑ جائیں اور ان کو سوچ سوچ کر خود کو پریشان نہ کریں۔ بلکہ ان کی پروانہ کرتے ہوئے اور ان کی باتوں کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان سے ذرا مناسب حد تک دوری اختیار فرمالیں۔ پھر دیکھیں آپ کی دعوت کا کیا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام احکام ایسے ہیں کہ ان پر مستقل کتب لکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں صرف اصول اور اساسی باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، تفصیل وجزئیات بیان کرنا مقصود نہیں۔

۳۔ داعی کو "مدعو الیہ" (اللہ تعالیٰ) کے متعلق معلومات بھی ٹھیک ٹھاک ہونی چاہئیں، تاکہ وہ اسکے متعلق جو کچھ بھی بیان کرے وہ بالکل درست اور علیٰ سبیلِ البصیرت ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک اچھے داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ علومِ شرعیہ (کتاب وسنت اور ان کے خادم علوم وفنون) میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔

۴۔ داعی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے "مدعوّ" (مخاطب جسے دعوت دے رہا ہے) کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہو، اور اس کے خیالات ونظریات

اور اس کے افکار وعقائد سے بخوبی آگاہ ہو۔ تاکہ اس کی تمام گفتگو مخاطب کے مناسبِ حال ہوسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو اسی نکتے پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّكَ تَاْتِیْ قَوْمًا مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ ۔ یعنی تم اہلِ کتاب کے ایک گروہ کے پاس جارہے ہو اس لئے ذہنی طور پر اچھی طرح تیار ہو کر اور دلائل وبراہین سے مسلح ہو کر جانا۔ کیونکہ وہ لوگ اہلِ علم ہیں۔ مشرکینِ مکّہ کی طرح جاہل نہیں۔ اور اہلِ علم کے ساتھ گفتگو اور دینی مباحثہ نسبتاً مشکل بھی ہوتا ہے اور مختلف بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں بھی مشرکینِ مکّہ کو اور طرح سے خطاب کیا گیا ہے اور یہود ونصاریٰ کو اور طرح سے۔ لہٰذا تمام جدید فکری فتنوں (کمیونزم۔ سوشلزم۔ ڈیموکریسی۔ سیکولرزم وغیرہ) اور تمام گمراہ فرقوں کے متعلق بنیادی معلومات ہر داعی کو حاصل ہونی چاہئیں۔ البتہ تفصیلی معلومات کے لئے ہر فرقے کے متعلق متخصص (سپیشلسٹ) داعی تیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

۵۔ داعی کو چاہئے کہ اس کی دعوت اکثر وبیشتر حالات و اوقات میں مثبت انداز کی ہو۔ یعنی اپنا موقف بیان کیا جائے اور اسے انتہائی مؤثر دلائل کے ساتھ مزین کیا جائے۔ باقی رہی مدِمقابل موقف کی تردید تو وہ کبھی کبھار ہونی چاہئے۔ جب کہ اس کی ضرورت انتہائی ناگزیر معلوم ہونے لگے۔ یعنی مخالف کی تردید کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنالینا چاہئے۔ کیونکہ اس سے داعی اور اس کے مخاطبین کی شخصیت منفی قسم کی بن جاتی ہے۔ حالانکہ شخصیت کی مضبوطی مثبت قسم کے امور سے وابستہ ہے۔ منفی چیزیں صرف دفاع کے لئے ہوتی ہے۔ جس طرح کہ انسان کو غذا تو ہمیشہ کھانی چاہئے کیونکہ اس کے ساتھ اس کی بقا وابستہ ہے۔ جب کہ دوا کو صرف بیماری کی ناگزیر صورت ہی میں استعمال کرنا چاہئے۔

۶۔ دعوت انتہائی سنجیدہ اور متین انداز میں ہونی چاہئے۔ مخالف پر طنز کرنا فقرے کسنا، اس کا استہزاء، اس کی توہین و تحقیر، لطیفہ بازی یہ سب امور سنجیدگی اور متانت کے خلاف ہیں۔ بلکہ مخاطب کو محسوس ہونا چاہئے کہ داعی کے دل میں واقعی اس کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ ہے، جو اسے دعوت دینے پر مجبور کر رہا ہے۔ تاکہ مخاطب میں انتقامی جذبہ اور ضدّ و عناد پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کا انداز انتہائی باوقار ہو۔ سر ہلا ہلا کر، جھوم جھوم کر، موسیقی کی سروں میں، گانے بجانے کے انداز میں تقریر و خطاب کرنا کسی طرح بھی داعی کے لئے مناسب نہیں۔ اس لئے کہ دعوتِ دین کا کام انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان کے لائق نہیں کہ وہ گانے بجانے کے انداز میں اپنی قوم کو خطاب کریں۔ لہٰذا جو امر ایک نبیؑ کے لائق نہیں، وہ ایک داعی کے لئے بھی مناسب نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ وہ نبیؑ ہی کا وارث ہوتا ہے۔ اسی طرح اندھا دھند زور لگا کر اور "بڑھکوں" کے انداز میں تقریر و خطاب سے اجتناب بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ بھی وقار و تمکنت اور دعوت و داعی کی شان کے منافی ہے۔

۷۔ دعوت مکمل دین کی دینی چاہئے۔ صرف چند مشہور اختلافی مسائل تک اسے محدود نہیں رکھنا چاہئے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مسئلۂ حاضر و ناظر، علمِ غیب، قبر پرستی، رفع یدین، آمین، تقلید وغیرہ کے علاوہ داعی کے پاس کوئی مسئلہ ہی نہ ہو جس پر وہ گفتگو کر سکے۔

۸۔ دعوت میں مسائل و احکام کے شرعی مقام و اہمیت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ جو مسئلہ اور حکم جتنی اہمیت کا حامل ہو اسے اتنی ہی اہمیت دینی چاہئے۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم یا اہم ترین نہیں بنا دینا چاہئے۔ اسی طرح مقصود بالذّات حکم کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود بالذّات نہیں بنا لینا چاہئے۔ مثلاً آج کل جلسوں اور تقریروں کو مقصود بالذّات بنا لیا گیا ہے، حالانکہ وہ دعوت و تبلیغ کے لئے محض وسیلہ و ذریعہ ہیں۔

۹۔ دعوت میں مناظرے کی قباحتوں، مثلاً غرور و تکبر، شہرت طلبی کا جذبہ، ریا کاری، ہر صورت میں اپنی برتری اور مخالف کی شکست دکھانے کا شوق وغیرہ سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔ اگرچہ یہ سب چیزیں رذائل اخلاق میں داخل ہیں، لیکن ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان سے خصوصی طور پر بچنے کا ذکر ضروری سمجھا گیا ہے۔

۱۰۔ "دعوت الی اللہ" کا مفہوم ہے: لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا۔ لہٰذا داعی کو چاہیے کہ لوگوں کو اپنی طرف نہ بلائے، نہ کسی اور شخصیت کی طرف دعوت دے، بلکہ اسکی دعوت صرف اور صرف اللہ رسولؐ اور ان کے دین کی طرف ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں دعوت میں اپنی یا کسی اور شخصیت کی اہمیت اجاگر کرنے کے بجائے اللہ رسولؐ اور ان کے دین کی اہمیت اجاگر کرنی چاہیئے۔

قُلْ هٰذِه سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۰۸) اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ الخ (النحل ۔ ۲۵)

۱۱۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے لوگوں سے فرداً فرداً بھی ملاقات کیا کرتے تھے، بلکہ ان کی دعوت کا زیادہ تر انحصار انفرادی اور شخصی تبلیغ ہی پر ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی زیادہ تر یہی طریقہ اپنانا چاہیئے۔ اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں مخاطب، داعی کی باتوں کو نسبتاً زیادہ توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سنتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کی باتوں کا میں اکیلا ہی مخاطب ہوں، جب کہ اجتماعی تبلیغ میں عام طور پر ہر شخص دوسرے کو اس کا اصل مخاطب قرار دے کر اپنے آپ کو بَرِیُ الذّمہ سمجھ لیتا ہے، اور نتیجتاً تبلیغ بے اثر رہتی ہے۔ الا ان یشاء اللہ۔

۱۲۔ اگر حالات کا تقاضا ہو تو اجتماعی تبلیغ بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی ممنوع نہیں۔ تاہم موجودہ دور کے نام نہاد تبلیغی جلسوں کے اسلوب اور ان کے اندر

ہونے والی قباحتوں سے کلیتہً پرہیز کرنا چاہئے، کہ ان سے دعوتِ دین کا کام بری طرح متاثر ہو رہا ہے (۱) لاؤڈ سپیکر کا بلا ضرورت اور بے تحاشا استعمال (۲) آدھی آدھی رات تک عوام کو بلاوجہ بٹھائے رکھنا۔ (۳) دورانِ تقریر مختلف قسم کے نعرے اور پھر ان کی حوصلہ افزائی بلکہ مقرّر وداعی کا جیوے! جیوے! اور زندہ باد! اور مردہ باد! قسم کے نعروں کا شدید متمنی ہونا۔ (۴) مساجد جیسے مقدّس مقامات کا تقدّس پامال کیا جانا (۵) نام لے لے کر مخالف شخصیّات پر کیچڑ اچھالنا (۶) تصویر سازی وغیرہ (۷) جلسہ گاہ کے قرب وجوار میں رہنے والے طلبہ اور مریضوں کو تنگ کرنا ــــــ یہ تمام امور دعوت وتبلیغ کے سراسر منافی ہیں۔

۱۳۔ جن لوگوں کو دین کی دعوت دینی ہو اگر وہ اس مقصد کے لئے کھانے کی دعوت پر بلا لئے جائیں تو داعی کے لئے دعوتِ دین کا کام کسی قدر آسان اور مدعوین کے لئے بہت حد تک سنجیدہ اور توجہ طلب ہو جاتا ہے، اور یہ طریقۂ دعوت وتبلیغ مسنون بھی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اسراف وتبذیر سے اجتناب کیا جائے، ورنہ مدعوّین کی توجہ دعوتِ دین کی بجائے دعوتِ طعام پر مرکوز ہو کر رہ جائے گی۔

۱۴۔ انسانی مزاج وخیالات بدلتے رہتے ہیں، اس لئے داعی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے بدلتے ہوئے خیالات ومزاج کا خیال رکھے اور ساز گار فضا اور مناسب ماحول میں دعوتِ دین پیش کرے۔ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے یہ کام نہیں کرتے رہنا چاہئے۔ اس سے فائدہ کے بجائے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔

۱۵۔ بدمعاش، غنڈے، چور، اچکے، ڈاکو وغیرہ قسم کے لوگوں کے لئے بھی دعوت وتبلیغ کا خصوصی پروگرام بنانا چاہئے۔ عام طور پر نیک لوگوں ہی کو تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی طرح فلمی اداکار، اخبار نویس، مصور وآرٹسٹ، شعراء وادباء بھی اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ انہیں بھی تبلیغ کی جائے کہ یہ لوگ معاشرے پر بہت

زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ نیز ڈاکو، چور قسم کے لوگ اگر درست ہو جائیں تو یہ
لوگ دوسروں کی بہ نسبت دین کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں

۱۵۔ بدمعاش، غنڈے، چور، اچکے، ڈاکو وغیرہ قسم کے لوگوں کے لئے بھی
دعوت و تبلیغ کا خصوصی پروگرام بنانا چاہئے۔ عام طور پر نیک لوگوں ہی کو تبلیغ کی
جاتی ہے۔ اسی طرح فلمی اداکار، اخبار نویس، مصوّر و آرٹسٹ، شعراء وادباء بھی
اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ انہیں بھی تبلیغ کی جائے کہ یہ لوگ معاشرے پر بہت
زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ نیز ڈاکو، چور قسم کے لوگ اگر درست ہو جائیں تو یہ
لوگ دوسروں کی بہ نسبت دین کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں
کیونکہ ان لوگوں کے اندر بڑے بڑے خطرات مول لینے کی جرأت اور زبردست
شجاعت ہوتی ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔

دعوتِ دین، حکمت، موعظہِ حسنہ اور جدال بطریقِ احسن

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

(النحل - ۱۲۵)

ترجمہ:- "(اے پیغمبر! لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت ودانائی اور عمدہ نصیحت (موعظہِ حسنہ) کے ساتھ بلاؤ! اور ان (دشمنانِ دین) سے بہترین (اور سلجھے ہوئے) طریقے سے جدال ومباحثہ کرو!"

۱۶- دعوت:- کا مفہوم تو واضح ہی ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ حق کی طرف بلانا تاکہ وہ اپنی زندگی دینِ حق کی روشنی میں بسر کریں اور دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوجائیں۔

۱۷- حکمت:- سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو دینِ حق کی طرف بے ہنگم طریقے سے نہ بلایا جائے بلکہ اس کے لئے ایسا طریقہ اپنایا جائے جو انتہائی دانائی پر مبنی ہو۔ اس سلسلہ میں ایک تو یہ پیشِ نظر رہے کہ اپنے موقف کے اثبات کے لئے انتہائی سنجیدہ اور باوقار انداز میں ایسے عام فہم قسم کے دلائل پیش کئے جائیں کہ مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ داعی اور مبلّغ کی زبان اور لب ولہجہ انتہائی نرم اور مشفقانہ ہو۔ داعی میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ سخت سے سخت موقف اور تلخ سے تلخ مسئلے کے بیان کے لئے انتہائی نرم اور شیریں الفاظ کا انتخاب کر سکے۔ حضرت موسیٰ وہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لئے بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:-

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰی - (طٰهٰ - ۴۴)

"کہ اس کے لئے نرم بات کہنا۔ شائد وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے"

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے، کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام خصوصاً آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فصیح اللسان کیوں تھے۔ گویا "دعوت بالحکمۃ" کے لئے ضروری ہے کہ داعی کا زبان وادب کے ساتھ گہرا تعلق ہو اور وہ اس کی باریکیوں کو بخوبی جانتا ہو۔ تیسرے یہ کہ مخاطب کو اشتعال میں لانے والی زبان اور سخت لب ولہجہ سے پرہیز کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ مخاطب کی اشتعال انگیز کارروائیوں پر صبر وبرداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔ پانچویں یہ کہ شخصیات کو زیرِ بحث لائے بغیر نفسِ مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شخصیات میں الجھانے کی غرض سے کہا تھا

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۔ (طٰهٰ - ۵۱)

تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتَابٍ لَا یَضِلُّ

رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی ۔ (طٰهٰ - ۵۲)

چھٹے یہ کہ مخاطب کی استعداد، ذہنیت، نفسیات، حالات اور موقع ومحل کو پیشِ نظر رکھ کر گفتگو کی جائے۔ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر دعوت وتبلیغ کا کام کرنا حکمت کے منافی ہے۔

الغرض حکمت کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں تقریباً تمام فضائل اخلاق کو اپنانا اور رذائل اخلاق سے خود کو بچانا بھی آ جاتا ہے۔

۱۸ موعظۂ حسنہ:۔ سے مراد یہ ہے کہ دورانِ تقریر وگفتگو ایسی چیزوں کا ذکر کیا جائے جن سے مخاطب کا دل نرم ہو، تاکہ بآسانی دعوتِ حق قبول کر سکے۔ مثلاً: زندگی کی بے ثباتی کا ذکر، موت کا ذکر، آخرت کی ہولناکیوں کا ذکر، عذابِ قبر اور عذابِ جہنم کا بیان وغیرہ۔ اسی طرح اس کی اخلاقی حس کو انگیخت کرنے والے کلمات اور جملوں کا موقع ومحل کے مطابق استعمال، تاکہ وہ بد اخلاقی پر نہ اتر آئے۔ گویا مخاطب

کے دل کو نرم کرنے والی اور اس کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے والی باتیں "موعظۂ حسنہ" ہیں۔

۱۹۔ جدال بطریق احسن:۔ سے مراد یہ ہے کہ مخالف کے ساتھ افہام و تفہیم کے لئے مبادلۂ خیال کیا جائے اور اس کے دلائل و شبہات کو سن کر ان کا مضبوط دلائل کے ساتھ ازالہ کیا جائے تاکہ دعوتِ حق کے قبول کرنے میں جو رکاوٹ ہے وہ دور ہو جائے۔

مخالف کے موقف پر تنقید اور اس کے دلائل کی تردید چونکہ بہت نازک کام ہے، کیونکہ اس میں پہلے دونوں کاموں (دعوت بالحکمہ اور موعظۂ حسنہ) کی نسبت مخاطب کے اشتعال میں آنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لئے یہاں بالصراحت یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ ایسا نازک کام انتہائی احسن طریق سے سرانجام دینا چاہئے تاکہ مخاطب میں ضد و عناد اور اشتعال پیدا نہ ہونے پائے۔

یہاں یہ بات از خود واضح ہو جانی چاہئے کہ "دعوت" میں اگر "حکمت و دانائی" اور "موعظہ حسنہ" کی شدید ضرورت ہے تو "جدال بطریق احسن" میں ان دونوں کی لازماً اس سے بھی زیادہ شدید ضرورت ہو گی۔ اس اہم نکتے کی طرف داعیانِ دین کی خوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

۲۰۔ داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوتِ دین کا اولیں مخاطب اپنے آپ کو سمجھے یعنی سب سے پہلے اپنے آپ کو اس کا پابند بنائے اور کوشش کرے کہ اس کا عمل اس کے قول کے مخالف نہ ہو، کیونکہ اس سے دعوت کمزور ہو جاتی ہے۔ اور مخاطب یہ بات سوچنے میں حق بجانب ہو گا کہ اگر اس کی دعوت سچی ہوتی تو داعی خود عملاً اس کی مخالفت کیوں کرتا؟

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرة ـ ٤٤)

ترجمہ:۔ "کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو"

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاَ تَفْعَلُوْنَ (الصف ـ ٢)

ترجمہ:۔ "کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟"

اس کے بعد داعی کے اہل وعیال کا حق ہے کہ انہیں دعوت دی جائے۔ اس کے بعد قریبی رشتہ دار اور پھر دور کے رشتہ دار، علیٰ ہذا القیاس جتنا کسی کا قریبی تعلق ہو گا، اتنا ہی اس کا دعوت کے بارے میں استحقاق زیادہ ہو گا۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحريم - ١١)

ترجمہ:۔ ”اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ!“

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعرآء - ٢١٤)

ترجمہ:۔ ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ!“

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ الخ

ترجمہ:۔ ”تم میں سے ہر شخص رعیت والا ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔“

۲۱۔ دعوت میں احکام ومسائل کی ترتیب وتدریج کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ یعنی جو مسائل سب سے اہم ہیں انہیں سب سے پہلے پیش کرنا چاہئے اور جو کم اہم ہیں انہیں بعد میں پیش کرنا چاہئے۔ چنانچہ سب سے پہلے عقائد وایمانیات اور قلبی عبادات[1] کی دعوت اور ان پر زور دینا چاہئے اور اس کے بعد ظاہری اعمال ومسائل پر۔ اس لئے کہ جس طرح دل کی اہمیت پورے جسم کے اندر سب سے زیادہ ہے اسی طرح دل سے تعلق رکھنے والے مسائل واعمال کی اہمیت بھی باقی تمام اعضاء وجوارح سے تعلق رکھنے والے مسائل واعمال سے زیادہ ہے۔ لہٰذا دعوت میں انہیں مقدم رکھنا چاہئے۔ کیونکہ دل کی اصلاح سے باقی تمام جسم کی بھی اصلاح ہو جاتی ہے۔

---

[1] عقیدے کی اصلاح کے لئے کتاب التوحید، مصنفہ محمد بن عبدالوہاب، تقویۃ الایمان، نصیحت المسلمین اور تذکیر الاخوان وغیرہ کا مطالعہ کرنا کرانا چاہئے۔ ایمانیات سے مراد: ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالتقدیر ہے۔ اس سلسلہ میں سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی ج ۴ پیش نظر رہنی چاہئے۔ اور قلبی عبادات سے مراد ہے:۔ اخلاص، توکل، صبر، شکر اور تقویٰ وغیرہ۔ قلبی عبادات کی تشریح وتوضیح کے لئے سیرۃ النبی مصنفہ سید سلیمان ندویؒ ج ۵ بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ الخ

اسی طرح مخاطب کے سامنے تمام مسائل واحکام یک مشت نہیں پیش کر دینے چاہئیں۔ بلکہ مخاطب کی استعداد وصلاحیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہیں تدریجاً پیش کرنا چاہئے۔ قرآنِ مجید کا تدریجاً نازل ہونا بھی اسی اصول کی تائید کرتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معلّمانہ عملی زندگی بھی اسی پر دال ہے۔

دینی مدارس برائے طالبات۔ تین باتوں کے خصوصی اہتمام کی ضرورت

آخر میں لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے دینی مدارس کے منتظمین ومنتظمات، معلّمین ومعلّمات اور وہاں کی طالبات کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ بھی ہماری مذکورہ بالا معروضات وتجاویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور انہیں اپنانے کی مقدور بھر کوشش فرمائیں۔ بلکہ طالبات کے دینی مدارس میں تو مزید تین چیزوں کا خصوصی خیال رکھنا چاہئے۔

۲۲۔ ایک یہ کہ انتظامیہ اور معلّمات کو سادگی کا بہترین نمونہ بن کر طالبات کو سادگی کی اہمیت بتانی چاہئے اور ایسا ماحول بنانا چاہئے کہ وہ بھی سادگی اپنانے پر دلی طور پر مجبور اور آمادہ ہو جائیں۔ کیونکہ سامانِ آرائش وزیبائش کا اکثر وبیشتر حصہ جائز وناجائز کا خیال رکھے بغیر تیار کیا جاتا ہے۔ نیز زیب وزینت کی طرف زیادہ توجہ انسان کو دیندار کے بجائے دنیادار بنا کر رکھ دیتی ہے۔

۲۳۔ دوسرے یہ کہ طالبات کی تربیت میں اس بات پر خصوصی توجہ دینی چاہئے کہ ان کے اندر جذبۂ مخدومیت وحاکمیت پیدا نہ ہونے پائے، کیونکہ اس سے عورت کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح ان کے ذہن نشین کرنی چاہئے کہ جو عورت جذبۂ خادمیت واطاعت سے سرشار ہو، وہ والدین کے گھر ہو یا خاوند کے گھر، اس کی زندگی ہر جگہ کامیاب وکامران اور باعزت ہوتی ہے۔

۲۴۔ تیسرے یہ کہ طالبات کی تعلیم وتربیت اس نہج پر ہونی چاہئے کہ وہ فراغت تک اس قابل ہو جائیں کہ آگے چل کر اپنی اولاد کی صحیح اسلامی تربیت کر سکیں۔ سب سے زیادہ اسی نکتے پر زور دینا چاہئے، تقریر وخطبے کی صلاحیت پیدا کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ سراسر مردانہ کام ہے،

عورت کی نسوانیت سے کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ شائد یہی وجہ ہے کہ صحابیات وتابعیات کے تذکروں میں ان کی نیکی وتقویٰ ، علم وعمل اور باہم وعظ ونصیحت کے واقعات تو ملتے ہیں، لیکن باقاعدہ اسٹیج وغیرہ لگا کر تقریر اور خطبوں کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

عملی زندگی کے حقیقی اسباب و محرکات

۲۵۔ داعی کے لئے ضروری ہے کہ اعمال کے اسباب و محرکات پر بھی اس کی نظر ہو، تاکہ اعمال کی نسبت ان کے اسباب پر زیادہ زور دے سکے۔ کیونکہ اسبابِ اعمال پیدا ہو جائیں تو اعمال از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں میں عملی تبدیلی کی زیادہ توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی یا پوری کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے سلسلۂ حرکت و عمل کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کئی قسم کے اسباب و محرکات کار فرما ہیں۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے اور متعدد اسباب و محرکات کے مزید اسباب و محرکات تلاش کئے جائیں تو یہ سلسلہ صرف ایک ہی سبب اور محرک پر جا کر رک جائے گا اور وہ ہے۔ محبت۔ زندگی کی محبت، دنیا کی محبت، راحت و آرام کی محبت، عیش و عشرت کی محبت، وطن کی محبت، بیوی بچوں کی محبت، عورت کی محبت، دولت کی محبت یا اللہ کی محبت، رسول ؐ کی محبت، دین کی محبت، جنت کی محبت وغیر ذلک۔

گویا کسی نہ کسی محبوب کی محبت ہی ہے جو انسان کو عملی جدوجہد پر آمادہ اور محنت و مشقت پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے اگر کسی داعی اور مبلغ کی شدید خواہش ہو کہ اس کے مخاطبین و سامعین میں ایک عملی انقلاب پیدا ہو جائے اور ان کی ساری زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے تو پھر اس داعی و مبلغ کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے مخاطبین و سامعین کے محبوبوں میں تبدیلی پیدا کر دے۔ کسی کا محبوب دنیا ہو گی، کسی کا دولت، کسی کا عورت، کسی کا دنیوی عزت و عروج، کسی کا کوئی اور۔ لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ ان تمام محبوبوں کی محبت کی جگہ پر اللہ اور رسول ؐ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور ایسے موضوعات پر تقریر و گفتگو کیا کرے جن سے اللہ اور رسول ؐ کی محبت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے، تاکہ ان کے اوامر و نواہی کی پابندی لوگوں کے لئے آسان ہو جائے۔ کیونکہ محبوب کی

بات کو ماننا آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا مفہوم ان دونوں سے شدید ترین محبت رکھنا ہی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ - ۱۶۵)

اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ -

اسی طرح قرآنِ مجید میں اکثر و بیشتر مقامات پر عمل صالح سے قبل ایمان کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اعمال صالحہ کی اصل بنیاد اور ان کا حقیقی سبب اور قوی ترین محرک ایمان ہی ہے۔اور ایمان کی اصل روح چونکہ محبت ہے، اس لئے اللہ اور رسولؐ پر ایمان اور ان کی شدید ترین محبت کے بغیر کسی انسان کی زندگی میں صحیح معنوں میں صالح انقلاب برپا نہیں کیا جاسکتا۔

محبت

محبت سے پیدا ہوئی کائنات
محبت ہے اصلِ حیات و ممات
محبت کی مرہون ہے زندگی
محبت کی ممنون ہے زندگی
محبت ہے خود کو مٹانے کا نام
مٹانے کا نام اور بنانے کا کام
محبت ہے اک جذبۂ سر بلند
بہت اونچی ہوتی ہے اس کی کمند
محبت میں ہوتا ہے طرفہ حساب
جو ناکام ہو وہ بھی ہے کامیاب
بنا دے ارادے کو عزمِ صمیم
محبت کی قوت ہے کتنی عظیم!

اللہ اور رسولؐ کی محبت کے حصول کا طریقہ:۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حصول کے لئے راقم کے خیال میں فطرت اور دینِ فطرت سے تین طریقے ثابت ہوتے ہیں ــــ مصاحبت و مجالست[1]. ذکر[2] اور یاد اور فکر[3] و مراقبہ۔

مصاحبت و مجالست:۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حصول کا پہلا ذریعہ و طریقہ یہ ہے کہ ایسے علماء و صلحاء کی صحبت و مجالست اختیار کی جائے جن کے سینے اللہ اور رسولؐ کی شدید محبت سے منور ہوں۔ کیونکہ صحبت کی تاثیر ایک مسلّمہ حقیقت ہے. جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اچھی صحبت سے اچھائی حاصل کر لیتی ہے اور بری صحبت سے برائی۔ چنانچہ اہلِ محبت کی صحبت سے محبت کے حصول میں بھی کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہئے۔

صحبت و مجالست کی تاثیر کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ ایک شخص کے خیالات و نظریات جو کہ لہروں اور موجوں (Waves) کی صورت میں ہوتے ہیں. اپنے ہم صحبت و ہم مجلس کے خیالات و نظریات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں .حتیٰ کہ وہ اس کے خیالات و نظریات سے متاثر ہو کر اپنے خیالات و نظریات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جس کے خیالات کی لہریں منضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں وہ مؤثر ہو جاتا ہے اور جس کے خیالات کی لہریں کمزور ہوتی ہیں وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ صحبت کی تاثیر کی تائید قرآن و سنت کی تعلیمات سے بھی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

- صحابی کو صحابی محض اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اسے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اور یہی صحبت رسولؐ کا شرف ہے،جس کی بنا پر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کو بڑے بڑے اولیاء اللہ پر فضیلت حاصل ہے۔

○ قرآنِ مجید میں اسلام کو دینِ فطرت قرار دیا گیا ہے:

فِطْرَةَ اللهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم - ۳۰)

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نومولود فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْیُمَجِّسَانِهٖ (بخاری و مسلم)

گویا صحبت وماحول کی تاثیر میں اتنی زبردست قوت ہے کہ انسان کی فطرت تک کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

○ ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک ہم مجلس وہم نشین کی مثال عطر فروش کی سی ہے۔ کہ یا تو وہ ویسے ہی تمہیں کچھ عطر دے دے گا، یا تم اس سے خرید لو گے، یا کم از کم اس کی عمدہ خوشبو سے لطف اندوز ہو سکو گے۔ اور برے ہم صحبت وہم نشین کی مثال آگ کی بھٹی میں پھونکنے والے (لوہار) کی سی ہے کہ یا تو اس کی ہم نشینی سے تمہارے کپڑے جل جائیں گے اور یا کم از کم اس (کے دھوئیں) کی بدبو تمہیں پہنچے گی۔

مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَالسَّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْكِ اِمَّا اَنْ یُّحْذِیَكَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا طَیِّبَةً وَنَافِخُ الْکِیْرِ اِمَّا اَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَكَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا خَبِیْثَةً (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اچھی یا بری صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے، خواہ تھوڑا ہی ہو۔ اسی وجہ سے قرآن وحدیث میں اچھی صحبت ومجلس اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبة - ۱۱۹)

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۔ (الکہف۔ ۲۸)

راقم کے خیال میں ایمان و محبت کے حصول کے لئے مصاحبت و مجالست کا راستہ سب سے زیادہ مؤثر، سب سے زیادہ فطرتِ انسانی کے قریب، سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مختصر (شاٹ کٹ) ہے۔ مگر اس میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ایسے اہلِ ایمان و محبت بآسانی میسر نہیں آتے، جن کی صحبت و مجلس میں بیٹھ کر انسان ایمان و محبت کی دولت حاصل کر سکے، بلکہ ایسے لوگ روز بروز کم سے کم تر اور نایاب سے نایاب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فیضِ صحبت کے حصول کے لئے کچھ شرائط و آداب ہیں، جو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: اخلاصِ نیت، عزم بالجزم، افادے کے بجائے استفادے کا جذبہ، تنقید نہ کرنا، تواضع وانکسار اور دوسروں کو اپنے آپ سے اچھا سمجھنا وغیر ذلک ـــــ لہٰذا اس سلسلہ میں تلاش و طلبِ صادق کے بغیر چارہ نہیں۔

فیضِ نظر کے لئے ضبطِ سخن چاہئے
حرفِ پریشان نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور

ذکر اور یاد:ـــــ ذکر اور یاد، محبت کا سبب بھی ہے اور محبت کی علامت بھی۔ کثرت سے کسی کا ذکر کرتے اور سنتے رہنے سے دل میں اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی محبت دل میں پیدا ہو چکی ہو تو انسان رہ رہ کر اسے یاد کرتا ہے، بے اختیار اس کا ذکر کرتا ہے اور ہر حیلے بہانے زبان پر اس کا نام لاتا ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ ۔

لہٰذا اگر کسی کی خواہش ہو کہ اس کا دل اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت سے روشن ہو جائے تو اسے چاہئے کہ اللہ اور رسولؐ کو کثرت سے یاد کرے اور ذکرُ اللہ اور ذکرُ الرسولؐ کو اپنی عادت بنا ڈالے۔

ذِکرُاللہ کے سلسلہ میں درجِ ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے!

۱۔ مختلف اوقات ومقامات میں پڑھی جانے والی مسنون دعائیں ترجمہ ومفہوم سمیت یاد کرلینی چاہئیں، تاکہ ان کو سُنّت کے مطابق پڑھا جاسکے۔ اس سلسلہ میں "پیارے رسول ؐ کی پیاری دعائیں"، اور اسی طرح کی دیگر کتابوں کو پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ اگرچہ ذِکرُ اللہ کے معنی اللہ کی یاد کے ہیں، لیکن جن الفاظ وکلمات سے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے انہیں بھی ذکر اللہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

سُبْحَانَ اللّٰہ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ ، سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

سب کے سب کلمات "ذِکرُاللہ" میں داخل ہیں۔

۳۔ اللہ کی محبت کے حصول کے لئے ذِکرُاللہ میں یکسوئی کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک تو ذکر شروع کرنے سے قبل سنجیدگی کے ساتھ استحضار نیت کرے۔ دوسرے یہ کہ ذکر کے لئے شور وشغب سے خالی کوئی خلوت کا مقام ہونا چاہئے، جہاں کسی کی طرف سے ذکر میں خلل اندازی نہ ہوسکے اور نہ ذکر ہی کسی کے کام میں خلل اندازی کر سکے۔ تیسرے ذکر کرتے وقت آواز نہ بہت بلند ہو اور نہ بہت پست۔ بلکہ درمیانی ہو۔ چوتھے ذکر کے الفاظ کو لمبی سانس کھینچ کر ایک ہی سانس میں سکون واطمینان کے ساتھ متعدد مرتبہ پڑھا جائے، کیونکہ اس طرح طبیعت میں نشاط وحرارت پیدا ہو جانے سے غفلت وسستی کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ لفظِ اَللّٰہ کو سُبْحَانَ اللّٰہ ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وغیرہ۔ زبان سے ادا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا تصور ذہن نشین کیا جائے۔ کیونکہ لفظ "اَللّٰہ" اور "اِلٰہ" کے مفہوم میں محبوبیت بھی شامل ہے۔ چنانچہ "لَآاِلٰہ" پڑھتے ہوئے ہر چیز کی محبوبیت کی نفی کی جائے اور "اِلَّا اللّٰہ" کہتے ہوئے اللہ کی ذات کے لئے محبوبیت کاملہ وتامّہ کا اثبات کیا جائے۔ چھٹے یہ کہ ذکر کے

لئے ایسا وقت منتخب کیا جائے جب ذاکر کا پیٹ بہت بھرا ہوا بھی نہ ہو کہ سارا وجود سست ہو جائے، اور بالکل خالی بھی نہ ہو کہ بھوک کی شدت ستانے لگے۔ ساتویں یہ کہ ذکر انتہائی مُحِبّانہ اور والہانہ انداز میں کیا جائے ــــ امورِ مذکورہ کو ملحوظ رکھنے سے ذکر کی تاثیر انشاء اللہ العزیز بہت بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی "ذِکرُ اللہ" ہی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لئے درجِ ذیل مسنون دعا خشوع و خضوع کے ساتھ کثرت سے کرنی چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِیْنِ وَاَنْ تَغْفِرَلِیْ وَ تَرْحَمَنِیْ وَاِذَا اَرَدْتَّ فِتْنَةً فِیْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِیْ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ وَاَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُقَرِّبُنِیْ اِلٰی حُبِّكَ۔
(احمد، ترمذی)

"اے اللہ ! میں تجھ سے نیک کام کرنے اور برے کام چھوڑنے کی توفیق اور مساکین کی محبت مانگتا ہوں۔ اور یہ کہ تو میری مغفرت کر دے اور مجھ پر رحم فرما۔ اور جب تو کسی قوم میں فتنے اور آزمائش کا ارادہ کرے تو مجھے فتنہ و آزمائش کے بغیر ہی اٹھا لے۔ اور میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں۔ اور ان لوگوں کی محبت بھی مانگتا ہوں جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ایسے عمل کی محبت بھی مانگتا ہوں جو مجھے تیری محبت کے قریب کر دے"

۵۔ قرآنِ مجید کی تلاوت بھی ذکر اللہ ہی کی ایک صورت ہے ــــ اس لئے قرآنِ مجید کو بڑے پیار اور محبت کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ اور اس کے معنی و مفہوم کو بھی قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اتارنا چاہئے۔

یہاں تک تو بات ہو رہی تھی ذکر اللہ کی۔ اب ذکر الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے بارے میں بھی چند باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

۱۔ ذِکرُ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بہترین اور مفید ترین طریقہ یہ ہے

کہ آپؐ پر کثرت سے درود وسلام پڑھا جائے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ یہ اللہ کا ذکر بھی ہے۔ لہٰذا اس سے ذکرُ اللہ کے فوائد بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ درود وسلام کی کثرت سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور خواب میں زیارت کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ درود وسلام پڑھنے والے پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں ــــ آپؐ کا فرمان ہے:

مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ عَشْراً۔
(مسلم)

اور قرآنِ مجید میں ہے

اِنَّ اللہَ وَ مَلَائِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔
(الاحزاب۔ ۵۶)

۲۔ ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپؐ کی سیرت کے حالات و واقعات خصوصاً معجزات وخوارق اور فضائل ومناقب سیرت وحدیث کی مستند کتابوں سے پوری توجہ کے ساتھ پڑھے یا سنے جائیں۔ اس سے بھی آپؐ کی محبت پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔

فکر ومراقبہ:ــــ فکر ومراقبہ پر گفتگو سے قبل ایک امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک شخص جب دوسرے سے محبت کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ یا تو اس کے حسن و جمال سے متاثر ہوتا ہے یا اس کے اوصاف وکمالات سے اور یا اس کے انعامات و احسانات سے۔ گویا یہ تینوں محبوبیت کے اسباب ہیں۔ جس میں جس قدر یہ اسباب پائے جائیں گے، اس میں اسی قدر محبوبیّت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال، اوصاف وکمالات اور انعامات واحسانات کی کیفیت وکمیت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں یہ تینوں اسباب بحیثیت انسان کے بدرجۂ اتم موجود تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ میں پائے جانے والے اسبابِ محبوبیت کی تفصیل کتبِ سیرت وحدیث میں موجود ہے۔ وہاں آپؐ کے حسن و جمال کا تذکرہ بھی ملتا ہے، آپ کے اخلاقِ عالیہ واوصافِ کمال کا بھی اور مخلوقِ خداوندی کو احسانات وانعامات سے نوازنے کا بھی۔

یہاں فکر ومراقبے سے ہماری مراد یہی ہے کہ ان اسبابِ محبوبیّت کی تفصیلات وجزئیات کا نقشہ ذہن میں بتکرار لایا جائے اور ان پر بار بار غور وفکر کیا جائے۔ مثلاً اس بات پر غور کیا جائے کہ آپؐ کس قدر خوبصورت تھے! مگر اس کے باوجود کوئی فخر وغرور نہیں، کوئی ناز ونزاکت نہیں، کتنا اونچا مقام تھا! مگر آرام وراحت کی کوئی خواہش نہیں، عیش وعشرت کی کوئی تمنا نہیں۔ بلکہ انتہائی سادہ اور پُرمشقت زندگی پسند فرمائی۔ دین کے لئے کیا کیا مصائب برداشت کئے؟ ہم تک دین پہنچانے کے لئے کیا تکالیف اٹھائیں؟ جسمِ مبارک زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوئے، کس لئے؟ فقط خلقِ خدا کی فلاح وکامرانی کے لئے۔ ہماری اُخروی نجات کے لئے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

اس طرح مسلسل غور وفکر کرتے رہنے سے محبت کا نقش دل میں خوب جاگزیں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محسن کے ساتھ محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسی غور وفکر اور سوچ بچار کے عمل کو فکر ومراقبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لئے بھی قرآنِ مجید میں یہی طریقہ بتایا گیا ہے کہ اس کی ذات والا صفات میں موجود اسبابِ محبوبیت پر غور وفکر کیا جائے، اس کے اسمائے حسنیٰ اور ان کے معانی پر غور وفکر کیا جائے۔ اس کی کائنات اور نظامِ کائنات پر غور وفکر کیا جائے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے اوصافِ کمال اور جود وسخاء اور انعامات واحسانات کا زیادہ سے زیادہ علم وادراک حاصل ہو اور لوگوں کے دل اپنے محسن کی محبت ومعرفت سے سرشار ہو جائیں۔

قرآنِ مجید میں جہاں کہیں بھی سوچ بچار اور غور وفکر کے مفہوم کے الفاظ آئے

ہیں ہمارے خیال میں ان سے یہی حقیقت مراد ہے جو اوپر فکر و مراقبہ کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (آل عمران۔ ۱۹۱)

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ الآية (الاعراف۔ ۱۸۵)

قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لئے اس کے اسمائے حسنیٰ، اس کی کائنات اور اس کے احسانات کا ذکر اور فکر ضروری ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرنے کے لئے آپؐ کی صورت و سیرت کا تذکرہ اور اس سلسلہ میں فکر و مراقبہ ضروری ہے۔

تقریر و خطاب کے لئے چند اصلاحی موضوعات

۲۶۔ آج کل اکثر علماء و خطباء عام طور پر ایسے موضوعات پر تقاریر ارشاد فرماتے ہیں جن کے ذریعے اپنے مخالفین کی خوب دل آزاری کی جا سکے اور موافقین کی خوب دادِ تحسین حاصل ہو سکے۔ گویا نہ مخالفین کی اصلاح مقصود ہے اور نہ موافقین کی۔ حالانکہ ان کی اکثر و بیشتر تقاریر اور خطبے ایسے موضوعات پر ہونے چاہئیں جن کے ذریعے سب کی اصلاح کی توقع کی جا سکے۔ ذیل میں چند ایسے ہی اصلاحی موضوعات و عناوین پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض عنوان اعمالِ صالحہ پر ابھارنے والے اسباب و محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض برے اعمال سے باز رکھنے والے امور و موانع کی۔

علمائے کرام اگر ان موضوعات و عناوین کی اہمیت کے قائل ہو جائیں اور ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کا خوب تفصیلی مطالعہ کریں اور اپنے دل و دماغ میں انہیں اچھی طرح اتار لیں اور پھر عوام الناس میں ان موضوعات پر اکثر و بیشتر تقاریر کرتے رہیں تو امید واثق ہے کہ معاشرے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہو جائے گی بلکہ ایک بھرپور صالح انقلاب کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

۱۔ جنت کی محبت اور اس کے حصول کا شوق ــــــ اس سلسلہ میں جنت پر ایمان، جنت کی نعمتوں اور آسائشوں، جنت میں داخل کرنے والے اعمال و عقائد پر روشنی ڈالنی چاہئے۔

۲۔ جہنم سے نفرت اور اس کے عذاب کا خوف ــــــ اس سلسلہ میں جہنم پر ایمان، اس کے اندر دیئے جانے والے مختلف عذاب اور جہنم میں داخلے کا سبب بننے والے اعمال و عقائد پر روشنی ڈالنی چاہئے۔

۳۔ نیک اعمال کے فضائل ــــــ اس سلسلہ میں جس نیک عمل پر بھی تقریر کی جائے اس کے دُنیوی، بَرزخی اور اُخروی فوائد و برکات اور اسرار و حِکَم پر بھی روشنی

جائے۔

۴۔ بُرے اعمال کی سزائیں ـــــ اس سلسلہ میں برے اعمال کے دُنیوی، بَرزخی اور اُخروی نقصانات اور شدید عذابوں اور سزاؤں کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ اخلاقِ حسنہ کے فضائل ـــــ اس سلسلہ میں اخلاقِ حسنہ سے متّصف غیر مسلموں کے واقعات بھی بیان کئے جاسکتے ہیں، تاکہ بداخلاق مسلمانوں کو شرم دلائی جاسکے۔ غالب کا درجِ ذیل شعر غالباً اسی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مَرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۶۔ اخلاقِ سیئہ کی قباحتیں ـــــ اس سلسلہ میں اخلاقِ سیئہ کے ہر قسم کے نقصانات بیان ہونے چاہئیں۔

۷۔ غلبۂ اسلام کا شوق و ولولہ ـــــ اس سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جہاد وقتال میں بے مثال محنتوں اور قربانیوں اور ان کے ذریعے حاصل ہونے والی عظیم فتوحات پر روشنی ڈالنی چاہئے۔ اسی طرح تاریخِ اسلام میں اٹھنے والی اصلاحی تحریکوں کے ایمان افروز واقعات بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔

۸۔ عام انسانی ہمدردی ـــــ اس سلسلہ میں ایسا مواد پیش کرنا چاہئے جس سے خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہو، اور دین ومذہب کا امتیاز روا رکھے بغیر سب پریشان حال لوگوں کے ساتھ تعاون کا راستہ ہموار ہو، تاکہ وہ غیر مسلم ہونے کی صورت میں اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوسکیں۔

۹۔ موت اور دنیا کی بے ثباتی ـــــ اس سلسلہ میں عذابِ قبر اور قیامت کے دن کے ہولناک واقعات ومناظر بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔

۱۰۔ معجزاتِ نبویہ ؐ وکراماتِ صحابہ ؓ واولیاء ؒ ـــــ اس سلسلہ میں بے سروپا قصے کہانیاں بیان کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تاہم اس موضوع کو یکسر

ترک کر دینا بھی مُضر اور ضعفِ ایمان کا سبب ہے۔

۱۱۔ ریڈیو، ٹی۔ وی، فلم اور ڈراموں کے مضرات۔

۱۲۔ تصویر سازی کے ذریعے عریانی و فحاشی کی اشاعت کے مضرات۔

۱۳۔ ماڈرن سائنسی ایجادات کے ذریعے اسلامی نظریات کی تائید۔

۱۴۔ اسلامی حکومت کے قیام کی شدید ضرورت ـــــ اس سلسلہ میں اسلامی حکومت کے فوائد و ثمرات اور غیر اسلامی حکومت کے مضرات و نقصانات پر بالتفصیل روشنی ڈالنی چاہئے۔

۱۵۔ مسلمان کے لئے آئیڈیل طرزِ زندگی سپاہیانہ طرزِ زندگی ہے۔

۱۶۔ قرآن و حدیث میں بیان کردہ پیش گوئیاں۔

۱۷۔ جدید و قدیم فتنے ـــــ اس سلسلہ میں فتنۂ دجّال پر خصوصی روشنی ڈالنی چاہئے۔

۱۸۔ سیکولرزم، کمیونزم، سوشلزم، کمیٹلزم اور ڈیموکریسی وغیرہ کے ساتھ اسلام کا تقابل۔

۱۹۔ خالص کتاب و سنت کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق کی دعوت۔

۲۰۔ مغربی تہذیب انسانیت کے لئے سمِ قاتل ہے۔

داعی کے لئے مسئلۂ معاش کی اہمیت قرآن و سنت کی روشنی میں

۲۷۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ روزی اور معاش کا مسئلہ انسانی زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ مگر اس کے متعلق قرآن و سنت کا نقطۂ نظر عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ لوگ اس کو بہت زیادہ بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ علمی دنیا میں اس پر کئی فلسفے اور بے شمار کتابیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔ آج کل علماءِ دین اور دیگر مذہبی حلقے بھی اس کی اہمیت کے کچھ زیادہ ہی قائل ہو گئے ہیں۔ آج کے دور کو اگر "معاش پرستی" کا دور کہہ دیا جائے تو شاید اس میں مبالغہ نہ ہو۔

اس صورتِ حال میں علماء و مبلغین کی خدمت میں چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں امید ہے کہ وہ ان کو قابلِ التفات سمجھیں گے۔

۱۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تمام حیاتِ طیبہ جملہ اہلِ اسلام کے لئے عموماً اور علمائے کرام کے لئے خصوصاً اسوۂ حسنہ ہے۔ اس لئے انہیں آپؐ کی معاشی زندگی اور اقتصادی حالت کو بھی اسوۂ حسنہ قرار دے کر اپنے لئے آئیڈیل (مثالی) زندگی سمجھنا چاہئے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ ان کی معاشی زندگی آپؐ کی معاشی زندگی کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو۔ کیونکہ علمائے کرام ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل وارث ہیں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی کے بارے میں کتبِ حدیث وسیرت میں بہت کچھ مواد موجود ہے۔ جامع ترمذی میں "باب معیشۃِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے مستقل باب قائم کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں بھی اس سلسلہ کی خاصی تصریحات موجود ہیں۔

(آپؐ کی معاشی زندگی کے متعلق ان تصریحات وتفصیلات پر مجموعی طور پر نظر ڈالنے سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے فکرِ معاش کو اپنے اعصاب پر سوار

نہیں کر رکھا تھا، کہ ہر وقت اسی کے بارے میں پریشان رہتے ہوں۔ بلکہ آپ نے اپنی سوچوں اور پریشانیوں کا مرکز و محور صرف اس بات کو بنا رکھا تھا کہ اللہ کے دین کو اس کی مخلوق تک کس طرح پہنچایا جائے۔

دوسرے یہ کہ آپ ؐ نے "معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے" مال و دولت اور سازو سامانِ دنیا کو طاقت کے باوجود زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ بلکہ مال و دولت کے خود بخود جمع ہو جانے کی صورت میں بھی آپ ؐ بقدر ضرورت اپنے پاس رکھ کر باقی تمام دولت کو عامۃ الناس میں بکھیر دیا کرتے تھے۔

تیسرے یہ کہ آپ ؐ اللہ تعالیٰ سے فراوانیِ دولت کی دعا کرنے کے بجائے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا وَ فِیْ رِوَایَۃٍ کَفَافًا

(بخاری ، مسلم)

"اے اللہ! آلِ محمد ؐ کو صرف بقدر ضرورت رزق عطا فرما!"

اندازہ کیجئے کہ معاش کے بارے میں آپ ؐ نے کس قدر زاہدانہ اور مثالی نظریہ پیش کر دیا ہے اور عملاً کتنا عظیم اور بلند معیار قائم فرما دیا ہے!

بعض لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تنگ دستی کو، سخت ناپسند کرتے ہوئے برداشت کرتے ہیں، بعض اس سلسلہ میں صبر و قناعت سے کام لیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے اقتصادی و معاشی ضعف اور تنگیِ رزق کے بارے میں "رضاء بالقضاء" کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ مگر رسول ؐ اللہ کی شان سب سے نرالی اور مقام سب سے اونچا ہے۔ بادشاہِ دو جہاں، ربُّ السمٰوات والارض کی بارگاہ میں خود درخواست کر رہے ہیں کہ مجھے خوش حالی و فراخیِ رزق کی ضرورت نہیں، مجھے بقدرِ ضرورت رزق عطا فرما! ـــــ گویا تنگ دستی کا سوال کیا جا رہا ہے ـــــ اللہ کی بارگاہ سے پیشکش ہوتی ہے کہ آپ کو بادشاہ بنا دیا جائے؟ اِنْ شِئْتَ نَبِیًّا مَلِکًا ۔ ادھر سے عرض کی جاتی ہے کہ نہیں! مجھے بادشاہت کی

ضرورت نہیں۔ مجھے عبدیت اور فقیری کی زندگی پسند ہے۔

فَقُلْتُ نَبِیًّا عَبْدًا۔ (مشکوٰۃ ص ۵۲۱)

اُدھر سے پیشکش ہوتی ہے کہ آپ کے لئے وادیِ بطحاء سونے کی بنا دی جائے؟ پہاڑ سونے کے بنا دیئے جائیں؟ ــــ اِدھر سے جواب عرض کیا جاتا ہے کہ نہیں یا رب! مجھے سونے چاندی کی کثرت اور دنیا کی دولت کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں، تاکہ تیرے سامنے تَضرُّع وعاجزی کروں اور تجھے یاد رکھوں۔ اور ایک دن سیر ہو کر کھاؤں، تاکہ تیری تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ ص ۴۴۲) ــــ عارفوں کی اصطلاح میں اسی کیفیت کو فقرِ اختیاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ع

سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آلِ رسولؐ کی یہی حالت رہی کہ انہوں نے جَو کی روٹی بھی مسلسل دو دن پیٹ بھر کر نہ کھائی۔ (بخاری و مسلم مشکوٰۃ ص ۴۴۶)

ہم لوگ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت نام لیتے ہیں، مگر آپؐ کی اس "معاشی سنت" (یعنی آپؐ کے فقرِ اختیاری) کی طرف نہ جانے ہماری توجہ کیوں نہیں جاتی، اسے ہم مناسب اہمیت کیوں نہیں دیتے، اسے عملاً کیوں نہیں اپناتے اور اس کی تبلیغ کیوں نہیں کرتے؟

۳۔ طلبائے دین ہوں یا علمائے دین، ان کی آپس کی باتیں سنی جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ عظیم القدر لوگ اپنے معاش کے بارے میں بہت پریشان اور متفکر ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ معاش کے بارے میں بے یقینی وپریشانی ــــ علمائے دین کے مقامِ رفیع سے بہت فروتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ دین کے ساتھ ان کے رزق و معاش کے سلسلہ میں تین وعدے فرما رکھے ہیں ــــ ایک عام مالدار آدمی کسی غریب شخص سے اس کی معاشی

کفالت کا وعدہ کر لے تو وہ اس کے وعدے پہ اعتبار کر لیتا ہے اور اس کے کام میں بے فکر ہو کر لگ جاتا ہے ـــ مگر اللہ تعالیٰ ـــ جو رزّاق ہے، جو رَبُّ السمٰوٰتِ وَالْاَرْض ہے، جو تمام خزانوں کا مالک ہے ـــ ہم سے تین دفعہ روزی رسانی کا وعدہ فرمائے اور ہمیں اعتبار ویقین نہ آئے۔ غور فرمائیے! یہ اس کی شان میں کتنی بڑی گستاخی اور بے ادبی شمار ہوگی! اعاذنا اللہ منہ۔

وعدہ نمبر ۱:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللهِ رِزْقُهَا ۔ (ھود ـ ۶)

"زمین میں چلنے والے تمام جانداروں کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے"

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۔ (العنکبوت ـ ۶۰)

علمائے دین بھی جانداروں میں داخل ہیں۔ لہٰذا ضمناً ان کے ساتھ بھی کفالتِ رزق کا وعدہ ہو گیا۔

وعدہ نمبر ۲: مشرکینِ مکہ کو مخاطب کر کے قرآن مجید میں پوچھا گیا ہے،

مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (یونس ـ ۳۱)

"آسمان اور زمین سے تمہیں کون رزق پہنچاتا ہے"؟ پھر بتایا گیا: فَسَيَقُوْلُوْنَ اللهُ ـــ "وہ کہیں گے، اللہ" اسی طرح قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر لوگوں کو بحیثیت انسان مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہارا رازق صرف اللہ ہے تو پھر عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہونی چاہئے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۔ اِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۔

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ـــ بے شک اللہ ہی رزّاق ہے، قوت والا مضبوط ہے"

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ـ اَلَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا الآية ـ
(البقرہ۔ ۲۱۔ ۲۲)

گویا اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت تمام نوعِ انسانی کے لئے عام ہے، نہ کوئی کافر و مشرک اس سے مستثنیٰ ہے نہ کوئی فاسق وفاجر اور نہ کوئی مومن و متقی ـــ جب تمام انسانوں کی روزی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اٹھا لی ہے اور وہ سب کو حسبِ وعدہ روزی پہنچا بھی رہا ہے تو کیا علمائے دین ہی ایسے گئے گزرے ہیں کہ وہ ان کو روزی نہیں پہنچائے گا! کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ یقیناً وہ انسان ہیں۔ بلکہ وہی اصل انسان ہیں ـــ لہٰذا اس اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمائے دین کے ساتھ معاشی کفالت کا ایک وعدہ ہو گیا۔

وعدہ نمبر ۳:ـــ

وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ـ
(الطّلاق۔ ۲۔ ۳)

”اور جو شخص اللہ سے ڈرے (تقویٰ اختیار کر لے) تو وہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کی سبیل پیدا کر دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو“

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ـ
(طٰہٰ ۔ ۱۳۲)

”اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کر! اور خود بھی اس کا پابند رہ! ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو ہم تجھے دیتے ہیں۔ اور عاقبت کی بہتری تقوے کے لئے (خاص) ہے“

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ـ
(الاعراف۔ ۹۶)

"اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور متقی بن جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے"

اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر مومن و متقی سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اسے بہرحال رزق دے گا، ماتحت الاسباب بھی اور مافوق الاسباب بھی۔ "مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" سے مافوق الاسباب ہی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

پہلے اور دوسرے وعدے میں تو علمائے کرام عمومی طور پر داخل تھے، مگر یہ تیسرا وعدہ تو گویا خصوصی طور پر علمائے دین ہی کے لئے ہے۔ کیونکہ ہر صحیح عالمِ دین مومن و متقی ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص عالمِ دین بن کر بھی مومن و متقی نہیں بننا چاہتا تو پھر اسے عالمِ دین بننے کی ضرورت ہی کیا ہے!

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر۔ ۲۸)

۴۔ چوتھی گزارش یہ ہے کہ طلباء و علمائے دین میں رزق اور معاش کے بارے میں بے یقینی و پریشانی اور انتشارِ ذہنی کی وجہ سے بہت سی قباحتیں جنم لے رہی ہیں، جو نہ صرف یہ کہ دعوتِ دین کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں بلکہ خود دین اور علمائے دین کے لئے بدنامی کا باعث بھی بن رہی ہیں۔

ایک قباحت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر صحیح معنی میں یقین نہ رکھنے والے علمائے کرام عام طور پر سرمایہ داروں اور سیٹھوں کو اپنا "رازق" سمجھ کر ان کی چاپلوسی، خوش آمد اور رضا جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ اُن موضوعات پر تقریریں کرتے ہیں جو ان کے "رازقوں" کو پسند ہوں۔ ان کے ناپسندیدہ موضوعات پر گفتگو سے احتراز کرتے ہیں۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ یہ لوگ خود ساختہ "رازقوں" کے سامنے کلمہ حق کہنے سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں اپنا "رزق" چھن جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

تیسری قباحت یہ ہے کہ ایسے علمائے دین لوگوں کو اصل دین کی دعوت دینے، ان کی اخلاقی، نظریاتی اصلاح کرنے اور ان کے اندر عملی تبدیلی پیدا کرنے کے بجائے انتہائی متعصبانہ انداز میں چند فرقہ وارانہ مسائل کو ابھارنے اور عوام کالانعام میں فرقہ واریت کو مزید مستحکم کرنے میں لگے رہتے ہیں، تاکہ ان کے پیٹ کا دھندا چلتا رہے۔

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

حصہ دوم

مسلمانوں کی نامسلمانیاں

اگر کوئی غیر مسلم اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام سے متاثر ہو جائے اور وہ چاہے کہ میں ان تعلیمات پر عمل پیرا معاشروں کو بچشمِ خود دیکھوں اور اس خواہش کو دل میں لئے مسلم ممالک کا دورہ شروع کر دے تو بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ یقیناً اس کے دل پر ایک قیامت گزر جائے گی۔ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو نقشہ قائم ہوا تھا، مسلم معاشروں کو اس کے برعکس پا کر لازماً اس کے ذہن کو ایک شدید دھچکا لگے گا۔ وہ سوچے گا، پھر سوچے گا اور پھر مزید سوچے گا کہ خداوندا! یہ وہی معاشرہ ہے جس کا نقشہ قرآن وحدیث میں کھینچا گیا ہے۔

وہ سوچے گا کہ میں نے مطالعہ کے دوران پڑھا یہ تھا کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں جن میں سے سب سے پہلا رکن ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور باقی تمام معبودانِ باطلہ وخود ساختہ کی عبادت کی نفی کرنا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کرنا، مگر میں دیکھ یہ رہا ہوں کہ مسلمان اللہ ہی کی عبادت کو چھوڑے ہوئے ہیں اور باقی ہر قسم کے معبودوں کی عبادت کئے جا رہے ہیں۔ فوت شدہ اولیاء اللہ کی عبادت بھی ہو رہی ہے، خواہشات کی پرستش بھی ہو رہی ہے، بُت پرستی بھی ہو رہی ہے، زَر پرستی بھی ہو رہی ہے، خود پرستی بھی ہو رہی ہے، اقتدار پرستی بھی ہو رہی ہے، الغرض ہر قسم کی پرستشیں ہو رہی ہیں، اگر نہیں ہو رہی تو صرف اللہ تعالیٰ کی کماحقہٗ پرستش نہیں ہو رہی۔

وہ سوچے گا کہ اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے، دن رات میں پانچ مرتبہ اس کی ادائیگی فرض کی گئی ہے، مگر میں دیکھ یہ رہا ہوں کہ مسلمان معاشرہ میں اس کی کوئی پروا نہیں کی جا رہی، اذانیں ہو رہی ہیں۔ بڑی بلند آہنگ اذانیں۔ سب سن رہے ہیں، مگر کوئی بھی نہیں سن رہا۔ اذانوں کی آوازیں کانوں سے ٹکرا ٹکرا

کر تھک گئی ہیں، مگر کان ہیں کہ سن ہی نہیں رہے۔ شاید بہرے ہو گئے ہیں۔ اگر کان سننے والے ہوتے تو جب ہر طرف اعلان ہو رہا ہے کہ اَللہُ اَکبر "اللہ سب سے بڑا ہے" تو اس کے سب سے بڑا ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے۔ تمام لوگ مساجد کی طرف بھاگ رہے ہوتے۔ مگر کوئی خرید وفروخت کے لئے بازار کی طرف جا رہا ہے، کوئی کرکٹ کے لئے کھیل کے میدان کی طرف جا رہا ہے، کوئی گلی کی نکڑ پر بیٹھے شطرنج سے دل بہلا رہا ہے۔ الغرض کوئی کچھ کر رہا ہے کوئی کچھ۔ ہاں! یہ سب لوگ وقت پاس کر رہے ہیں اور خود فیل ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر میں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہوئے تو کچھ اور ہی پڑھا تھا۔

وہ سوچے گا کہ اسلام کا تیسرا رکن زکوٰۃ ہے۔ جو غریبوں اور تنگ دستوں کی دست گیری کے لئے ہے، مگر دیکھا یہ ہے کہ تنگ دستی کی بنا پر جا بجا کوچہ وبازار میں جسم بک رہے ہیں۔ کتنے ہی فقر ومسکنت کے مارے ہوئے۔ خاک میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی ظلم وتشدد کے شکار، خون میں نہلائے ہوئے ہیں۔ کتنی ہی دوشیزائیں جہیز کی تیاری کا انتظار کرتے کرتے اپنی جوانی کا ماتم کرنے لگ گئی ہیں۔ کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو کوٹھیوں میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو سرما اور گرما کی راتیں فٹ پاتھوں پر آسمان کی چھت تلے گزارنے پر مجبور ہیں۔ کیا یہ مسلمان معاشرہ ہے؟

وہ سوچے گا کہ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر سے یہ بات گزری تھی کہ مسلمان کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ وعدہ کرتا ہے تو اسے ایفا کرتا ہے، بات کرتا ہے تو سچی۔ مگر میں نے بازاروں میں، مارکیٹوں میں اور بڑے چھوٹے تمام کاروباری مراکز میں جا کر بچشم خود مشاہدہ کیا ہے کہ لوگ کذب بیانی کو برا نہیں سمجھتے بلکہ اسے عادت بنائے ہوئے ہیں، وعدہ ایفا کرنا ضروری خیال نہیں کرتے اور دھوکا بازی سے احتراز کرنا تو کجا اسے کاروبار میں کامیابی کا زینہ تصور کیے ہوئے ہیں۔

وہ سوچے گا کہ رمضان کے روزے رکھنا بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ مگر مسلمان اسے بھی اتنا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ علی الاعلان اور کچھ لوگ چُھپ چُھپا کر روزہ خوری کر رہے ہیں۔ کتنے ہی ہوٹل اور ریستوران دن کے وقت بند ہونے کے بجائے صرف پردہ لٹکا لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وہ سوچے گا کہ مطالعہ کے دوران یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اسلام صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی عزت و عصمت اور جان ومال کی حفاظت کرتا ہے، مگر دیکھا یہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مسلمانوں ہی کی عزت و عصمت لٹ رہی ہے اور معمولی سے جھگڑوں کی بنا پر بے گناہوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ اور راتوں کی تاریکی میں نہیں، بلکہ دن کی روشنی میں چوریوں اور ڈاکوں کا بازار گرم ہے، نہ چور کے ہاتھ کٹتے ہیں، نہ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے، نہ قاتل سے قصاص لیا جاتا ہے اور نہ دیگر جرائم کی سزائیں دی جاتی ہیں۔

وہ سوچے گا کہ مسلمانوں کے ملک میں مسلمانوں ہی کی طرف سے قوانینِ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں ہی کی طرف سے اس مطالبے کی مخالفت میں آوازیں اٹھتی ہیں۔ معذرتیں پیش کی جاتی ہیں اور کئی قسم کے حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس وہ اسلام سے متاثر ہونے والا غیر مسلم ممالکِ اسلامیہ کا دورہ کرتے ہوئے بہت کچھ دیکھے گا اور بہت کچھ سوچے گا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کا اسلام درست نہ کر سکا، برائیوں سے روک نہ سکا اور ان میں بلند کرداری پیدا نہ کر سکا۔

اس دورے کے دوران اگر ہمارے ساتھ اس کی ملاقات ہو جائے اور وہ ہم سے اس کا سبب دریافت کرے تو ہم اسے بتائیں گے کہ بھائی! اس کے بہت سے

اسباب ہیں، جن کا تذکرہ طوالت کا باعث ہو گا۔ اسے کسی اور ملاقات پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سرِدست مختصر طور پر اتنا یاد رکھو کہ

بیمار دوائی کھاتا نہیں بدنام طبیب کا نام ہوا
ہوئے کام بُرے تو مسلماں سے اور رُسوا دین اسلام ہوا

دینِ سلف اور دینِ خلف

خالص ریشم اور مصنوعی ریشم کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، جنگل کے شیر اور قالین کے شیر کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، حقیقی خارجی دنیا اور کاغذ کے نقشے پر نظر آنے والی دنیا کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، عالمِ بیداری میں سرانجام پانے والے کام اور عالمِ خواب میں کئے جانے والے کام کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، کیا تم جانتے ہو؟

اور کیا تم جانتے ہو کہ چلتے پھرتے زندہ انسان اور کسی کپڑے کی دکان میں نظر آنے والے پتھر کے بنے ہوئے، کپڑوں سے سجے ہوئے انسان کے درمیان کیا فرق ہے؟ فوت شدہ بیٹے کی غمزدہ ماں کے نوحے کے درمیان اور اُجرت پر نوحہ کرنے والی اجنبی عورت کے نوحے کے درمیان کیا فرق ہے؟ سرمئی آنکھوں اور سرمہ ڈالی ہوئی آنکھوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ میدانِ جنگ میں کسی سپاہی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لوہے کی تلوار اور برسرِ منبر کسی خطیب کے ہاتھ میں تھامی ہوئی لکڑی کی تلوار کے درمیان کیا فرق ہے؟ ــــــ اور کیا تم زندہ انسانوں اور پردۂ سکرین پر حرکت کرنے والے انسانوں کے درمیان فرق پہچانتے ہو؟ آواز اور اس کی باز گشت کے درمیان فرق پہچانتے ہو؟ کیا تمہیں کسی درخت کی شاخ پر اُگنے والے حقیقی پھول اور کسی انسانی ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذی پھول کے درمیان فرق معلوم ہے؟ ــــ اگر معلوم ہے تو پھر یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دینِ حقیقی اور دینِ مروج کے درمیان بھی وہی فرق ہے ــــ وہی فرق جو مکمل طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا مگر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کا دورِ اولیں ترقی و عروج کے لحاظ سے جس قدر حیرت انگیز تھا ان کا دورِ آخریں بھی اسی قدر حیرت انگیز ہے ــــ مگر زوال اور تنزل کے لحاظ سے ــــ دورِ اولیں میں انہوں نے جنگیں کیں، ناممکن نظر آنے والے کارنامے سرانجام

دیئے۔ فتوحات حاصل کیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام دنیا کی قیادت وسیادت ان کے ہاتھ میں آ گئی ـــــ اور بعد کے دور میں ایسے زوال اور تنزل کا شکار ہوئے اور ایسی پستیوں میں جا گرے کہ وہاں سے نکلنا انہیں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آنے لگا ہے ـــــ ترقی وعروج کے دور میں مسلمانوں نے وقت کی مضبوط ترین اور قوی ترین قوموں کو اپنا غلام بنا لیا اور زوال وتنزل کے عہد میں اس بُت پرست ہندو قوم کے غلام بن گئے جن کی تاریخ غلامی وتعبّد کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اور اس یہودی قوم کے غلام بن گئے جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے کہ ان پر ذِلت ومسکنت مسلط کر دی گئی تھی۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ (البقرہ آیت ٦١)

حالانکہ قرآن مجید ہمارے پاس بھی وہی ہے جو دورِ اول کے مسلمانوں کے پاس تھا۔ اسلام کی تعلیمات بھی وہی ہیں جو انہوں نے حاصل کی تھیں اور لَا اِلٰهَ اِلَّا الله بھی وہی ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے۔ مگر ہمارے درمیان اور ان کے درمیان اتنا فرق کیوں ہے؟

مسلمانوں کے حیرت انگیز عروج وزوال کا حقیقی سبب

تاریخ کے نقاد اور محقق علماء اور مفکرین ومصلحین امت مسلمانوں کے حیرت انگیز عروج اور حیرت انگیز زوال پر شدید حیرت کا شکار ہیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ اس کے اسباب تلاش کرتے ہوئے کتبِ تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ اس کی علّت معلوم کرنے کے لئے سوچتے ہیں اور سوچتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کسی کو کوئی علّت معلوم ہوتی ہے اور کسی کو کوئی سبب ہاتھ لگتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس کا صرف اور صرف ایک ہی سبب ہے۔ اور وہ ہے دینِ حقیقی اور دینِ مروّج کے درمیان فرق۔ زمانۂ عروج کے مسلمان دینِ حقیقی کے علمبردار

تھے اور دورِ تنزل کے مسلمان دینِ مروّج کے حامل۔ وہ دین کو اپنائے ہوئے تھے اور یہ دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔ ۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

(اقبال)

دینِ مروّج چند حرکات وسکنات اور الفاظ کا نام ہے۔ اس سے آگے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ دین بہانہ تراش وحیلہ ساز ہوتا ہے۔ مشکل حالات میں ثابت قدم رہنے کے بجائے ان سے پہلو تہی کرتے ہوئے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآنِ مجید بیان کرتا ہے کہ کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں کہ جب انہیں میدانِ جہاد کی طرف چلنے کا حکم ملتا ہے تو کہتے ہیں: اگر ہم جہاد پر روانہ ہو گئے تو ہمارے گھر اور ہمارے اہل وعیال غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہمارے بعد ان کا خیال رکھنے والا، نگرانی اور حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ چنانچہ اس قسم کے مسلمان، جب جہاد اور دین کے لئے جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے، تو راہِ فرار اختیار کرنے کے لئے کئی قسم کے حیلے بہانے تراشتے ہیں: ع

کارِ دوناں حیلہ وبے شرمی است

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَّمَا هِىَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۔

(سورۃ الاحزاب آیت ۱۳)

دینِ حقیقی قلب وقوت کا دین ہے، روشنی وحرارت کا دین ہے۔ اس کا حامل انسان جہاد وشہادت کا مشتاق ہوتا ہے۔ اس کے وسائل نہ پاکر آنسو بہاتا ہے۔ مشکل ونازک حالات میں ثابت قدم رہتا ہے۔ دشمن پر پلٹنے جھپٹنے کو لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ سمجھتا ہے۔ ع

کارِ مرداں روشنی وگرمی است۔

قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا

اَنْ لَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۔ (سورۃ التوبہ آیت ۹۲)

دینِ حقیقی "اکسیر" ہے، جس سے مُردہ انسان زندہ ہو جاتا ہے، کمزور قوی ہو جاتا ہے۔ یہ تانبے، چاندی اور سکے کو سونا بنا دیتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس سے ایسے ایسے عجیب وغریب کارنامے اور خارقِ عادت قسم کے امور معرضِ وجود میں آتے ہیں، جن کے سامنے عقل، سائنس، علم، فلسفہ، تاریخ سب حیرت زدہ "محوِ تماشائے لبِ بام" رہ جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجیہ وعلّت کس طرح بیان کی جائے۔ ان کی تشریح وتفسیر کس طرح کی جائے۔

رنج وغم، فکر وپریشانی کے بچھو، بدنظمی ولاقانونیت، انتشار وخلفشار، حیوانیت ودرندگی کے سانپ جب حیات وکائنات کو ڈس ڈس کر زہریلا بنا دیتے ہیں اور اس کے لبوں پر المدد! المدد! کی فریاد ہوتی ہے اور دنیا بھر کی عقل وخرد کی طرف سے اسے مایوس کن قسم کا جواب ملتا ہے تو ایسے نازک حالات میں دینِ حقیقی ہی اس کی فریاد رسی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤ! میرے پاس تمہارا علاج موجود ہے۔ کیونکہ میں ہی عربی ہوں۔ میں ہی وہ "تریاق" ہوں جو تمہاری تمام زہرناکیوں کو نیست ونابود کر سکتا ہے، اور ان تمام مہلک زہریلے اثرات کا خاتمہ کر سکتا ہے جو ملحدانہ فلسفہ ہائے حیات اور طاغوتی نظامہائے زندگی پیدا کرتے ہیں ۔

دلِ گیتی اَنَا الْمَسْمُوم اَنَا الْمَسْمُوم فریادش
خرد گوید کہ مَا عِنْدِیْ بِتِرْیَاقٍ وَّلَا رَاقِی

(اقبال)

دینِ حقیقی وہ برقی رَو ہے جس کے اتصال سے زندگی کی گاڑی حرکت میں آ جاتی ہے اور انسان سے اعمالِ صالحہ صادر ہونے لگتے ہیں اور اس کے منقطع ہوتے ہی نہ حرکت باقی رہتی ہے اور نہ اعمال صالحہ۔

دینِ حقیقی روح وقلب کا نام ہے، جذبہ وحرارت کا نام ہے۔ جب یہ روح کی

گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو انسان حق کے لئے غضبناک بھی ہوتا ہے۔ ظلم سے نفرت بھی کرتا ہے اور عدل وانصاف قائم کرنے کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مگر دینِ مروّج کیا ہے؟ نحو، صرف، اعراب، کلام اور تاویل۔ اور طویل و عریض جُبّہ ودستار، جن میں جاہ ومنصب کی حرص اور خود غرضی واستکبار کی ہوا بھری ہوتی ہے۔

معرفت در جُبّہ ودستار نیست
آں عزیزاں را نشانِ دیگر است

دینِ حقیقی کا حامل انسان سیاست وسلطنت سے بہت بالا، سربلند اور بلند قامت ہوتا ہے۔ اس کے فقرو استغناء کے رعب وجلال کی بنا پر اہلِ حکومت اپنے ایوانِ اقتدار میں ہر دم لرزہ بر اندام رہتے ہیں۔ اور دینِ مروّج کے حامل افراد اپنی حریصانہ وبزدلانہ طبیعت کی وجہ سے اہلِ اقتدار کا تقرب حاصل کرتے ہیں، اقتدار کے خدمت گزار بن کر زندگی بسر کرتے ہیں اور اصحابِ اقتدار کی ناراضی کے خوف سے ہر لحہ کانپتے رہتے ہیں۔

دینِ مروّج میں لا إلٰہ إلا اللہ خواہشاتِ نفسانیہ کے آگے جھک سکتا ہے اور دنیا میں ذلت ومسکنت اور غلامی کے ساتھ مصالحت وموافقت بھی کر لیتا ہے۔ یہ دین ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے سے اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے، مگر دینِ حقیقی پہاڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

دینِ مروّج میں "لا إلٰہ إلا اللہ" الفاظ کا ایک مجموعہ ہے، جس کے کوئی معنی نہیں، ایک قول ہے، جس کا کوئی مدلول نہیں۔ مگر دینِ حقیقی میں "لا إلٰہ إلا اللہ" سب کچھ ہی ہے۔ بتانِ زروسیم کی پرستش کے ساتھ عداوت بھی ہے اور صنمِ اقتدار کے خلاف بغاوت بھی۔ جاہ ومنصب سے بے نیازی بھی ہے اور خواہشات کے بتانِ وہم وگماں کی عبادت سے نفرت اور اس کی مخالفت بھی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ دنیا کے

تمام زندہ و مردہ معبودانِ باطلہ وخود ساختہ "لا اِلٰہ الا اللہ" کی زد میں ہیں۔ حقیقی لا اِلٰہ الا اللہ کی زد میں۔ وہ لا اِلٰہ الا اللہ جو دل کی گہرائیوں سے کہا جاتا ہے، جو شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی پہنائیوں اور وسعتوں میں سماجاتا ہے۔

چو گویم من مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

(اقبال)

لا اِلٰہ الا اللہ لا الٰہ الا اللہ، لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

..... قصۂ جدید و قدیم

مالک مکان نے اپنے ملازم کے ہاتھ میں ایک نقشہ اور کثیر رقم دیتے ہوئے کہا۔ "اس مکان کو اس نقشے کے مطابق تعمیر کرا دو۔ ایک ماہ کے بعد آ کر جائزہ لوں گا اور تمہارا حساب بے باق کر دوں گا۔"

ملازم نے سوچا کہ یہ تو بہت مشکل کام ہے، پہلے پرانے مکان کے در و دیوار کو گرایا جائے، پھر ملبہ اٹھوا کر صفائی کرائی جائے پھر مزدوروں، مستریوں کے ساتھ معاملہ او ہر روز کی بحث و تکرار اور نت نئے دردِ سر! بجائے اس کے کہ مکان کی از سرِ نو تعمیر کی جائے کیوں نہ نقشے کی از سرِ نو تعمیر یا تعبیر کر لی جائے! چنانچہ اس نے اپنی اس انقلابی اور ترقی پسندانہ سوچ کے مطابق مکان کو نقشے کے مطابق بنانے کے بجائے نقشے کو مکان کے مطابق بنا دیا۔ ایک ماہ کے بعد مالک نے آ کر اپنے ذہین وفطین ودانشور ملازم کے ساتھ جو سلوک کیا ہو گا اور اسے جس انعام و اکرام سے نوازا ہو گا اس کا آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔

تمام اسلامی ممالک میں کچھ اسی کے ساتھ ملتی جلتی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ ثقہ قسم کے اہلِ علم کی اکثریت اور عوام کی کثیر تعداد کی دیرینہ آرزو ہے کہ نظام مملکت کے مکان کو اس نقشے کے مطابق تعمیر کیا جائے جو قرآن وسنت کی صورت میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ اس مخلصانہ آرزو کی تکمیل کے لئے یہ لوگ اپنی امکانی حد تک ہمیشہ سرگرمِ عمل بھی رہتے ہیں اور دعاگو بھی۔

مگر اس کے برعکس معدودے چند ناہنجار قسم کے اہلِ قلم، ادب سے خالی ادیبوں، علم ودانش سے عاری علماء اور دانشوروں کی یہ ضد ہے کہ مکان کو نقشے کے مطابق تعمیر کرنے کے بجائے نقشے کو مکان کے مطابق بنایا جائے۔ کہ یہ کام سہل ہے اور وہ انتہائی دشوار۔ کیونکہ اس کے لئے اولاً اپنے ہاں سے انگریزی قانون اور مغربی تہذیب وتمدن کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ہو گا۔ ان کے

درودیوار کو مسمار کر کے ان کے ملبہ کو ٹھکانے لگانا ہو گا اور پھر ان کی جگہ پر اسلامی قانون کی عمارت کو انتہائی دلسوزی اور احتیاط کے ساتھ استوار کرنا پڑے گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام بازیچۂ اطفال نہیں ہے، یہ تو انتہائی صبر آزما اور خونِ جگر کا طلب گار فریضہ ہے جسے سرانجام دینا ہر کس وناکس کا کام نہیں، بلکہ ع

انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

یہ صورتِ حال کسی خاص ملک کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اس مسئلہ (پرابلم) اور صورتِ حال سے پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، مصر، عراق، شام اور انڈونیشیا سمیت تقریباً تمام اسلامی ممالک دوچار ہیں۔ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو تہذیبِ مغرب کا دلدادہ، یورپ کی مادی ترقی سے مرعوب اور اسلام کی سادہ وپروقار وسنجیدہ تہذیب کے متعلق احساس کہتری کا شکار ہے۔ ان لوگوں کی گفتار اور کردار سے وقتاً فوقتاً اس احساسِ کہتری کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔

ان لوگوں نے چند ایک جملے ازبر کر رکھے ہیں، جنہیں موقع بہ موقع استعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "اسلام جدیدیت کے خلاف نہیں" اپنی جگہ پر یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام جدیدیت کے خلاف نہیں، لیکن اس کی آڑ لے کر جدید وتازہ لباس پہن کر آنے والی ہر برائی، ہر بے شرمی اور بے حیائی کو تو قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کی نشر واشاعت ہی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ جب اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان کے درپردہ اسی طرح کے مقاصد ہوتے ہیں۔ تہذیبِ مغرب سے تعلق رکھنے والی ہر بات اور ہر چیز کو فروغ دینے اور سندِ جواز مہیا کرنے کے لئے اس پر جدیدیّت کا لیبل لگا دیتے ہیں، تاکہ اگر کوئی شخص اسلام کے حوالے سے اس کی تردید کرنے لگے تو فوراً کہا جا سکے کہ "اسلام، جدیدیّت کے خلاف تو نہیں ہے"۔

چنانچہ جدیدیّت کے شوق کی فراوانی اور ہر نقشِ کہن کو مٹا دینے کے ذوق کی طغیانی ان لوگوں کے منہ سے بعض اوقات ایسے ایسے جملے اگلوا دیتی ہے جن سے

نہ صرف ارتداد کی بُو آتی ہے، بلکہ وہ الحاد کی غلاظت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید دور کے ایک نام نہاد دانشور کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ، اندازہ کیجئے، کس قدر بدبو دار ہیں:

"ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزا جابرانہ ہے۔ اس قسم کے قوانین ختم کر دینے چاہئیں"۔

اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ "اسلام سائنس کے خلاف نہیں" یا "سائنس اسلام کے خلاف نہیں" یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل درست اور بجا ہے کہ اسلام اور سائنس میں کوئی مخالفت نہیں۔ لیکن اسلام اور سائنس کے مابین مخالفت نہ ہونے سے یہ تو ثابت نہیں ہو جاتا ہے کہ ریڈیو، ٹی وی وغیرہ سائنسی ایجادات کے معرضِ وجود میں آ جانے سے عریانی، فحاشی، بے شرمی و بے حیائی کے کام جائز ہو گئے ہیں یا ان کی نشر واشاعت ترقی وعروج کی علامت وضمانت بن گئی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ سائنس اور اسلام کے مابین نہ صرف یہ کہ کوئی مخالفت نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تائید وتصدیق کرتے ہیں۔ یہاں ہم یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہتے کہ سائنس کی ایجادات نے اسلام کے کون کون سے احکام کی تائید وتصدیق کی ہے، کیونکہ یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے، تاہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جنّ وانس کے علاوہ باقی تمام کائنات اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل پابندی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات میں ایک خاص نظم، ترتیب وتسلسل اور کمالِ حسن پایا جاتا ہے۔ لیکن جنّ وانس کو چونکہ کسی حد تک بااختیار بنایا گیا ہے اس لئے انہیں خاص دائرے کے اندر رہتے ہوئے خود مختارانہ طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اب اگر انسان بھی باقی تمام کائنات کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتا ہے تو وہ تمام کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اور اسی میں اس کی فلاح و کامرانی مضمر ہے۔ اسی طرح سائنس بھی قطعاً یہ نہیں سکھاتی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے

احکام وفرامین کی مخالفت یا ان سے بغاوت کریں، بلکہ سائنس ہمیں فی الواقعہ یہ درس دیتی ہے کہ جس طرح کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کے چند غیر مرئی قواعد وضوابط کا پابند، مسلم (مطیع وفرماں بردار) ہے، اسی طرح تمام نوعِ انسانی کو بھی اللہ تعالیٰ کے تمام احکام وقواعد کی پابند اور مسلم (مطیع وفرماں بردار) ہونا چاہیئے۔ اس سائنسی حقیقت کی طرف قرآنِ مجید میں کئی ایک مقامات پر اشارات کئے گئے ہیں۔

وَلَـهُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰاتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ احکامِ اسلام بہت پرانے ہو چکے ہیں اور زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے، لہٰذا زمانے کے تقاضے کے مطابق احکامِ اسلام کی کانٹ چھانٹ کر لینی چاہیئے، تو اس سلسلہ میں ہم "دانشوروں" کی خدمت میں یہی عرض کریں گے کہ جناب! یہ چاند ستارے، کہکشاں، سورج، آسمان اور زمین سب اشیائے کائنات پرانی ہو چکی ہیں اور ایک ہی ڈگر پر صدیوں سے چل رہی ہیں۔ لہٰذا ان کے وجود یا کم از کم ان کے معمولات ہی کو تبدیل کر ڈالیئے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آپ کو احکامِ اسلام میں بھی تبدیلی کا حق دیا جا سکتا ہے۔ تمام کائنات اپنے پرانے اسلام (اللہ تعالیٰ کے احکام وفرامین) پر چل رہی ہے اور خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہے، اس لئے انسان کی خوشگوار زندگی اسی بات پر منحصر ہے کہ وہ بھی اپنے پرانے (سلفیانہ) اسلام پر عمل پیرا ہو۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید وقدیم

آخر میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بہت شفیق مہربان اور ارحم الراحمین ہے، اس کے تمام احکام اس کی رحمت وشفقت

پر مبنی ہیں۔ حدود وتعزیرات اسلامی میں جو بظاہر شدت وسختی نظر آتی ہے وہ بھی درحقیقت اسکی اپنے بندوں پر رحمت وشفقت ہی کی ایک صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تقریباً تمام سورتوں کا آغاز "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے کیا گیا ہے۔ جن سورتوں میں بظاہر سخت احکام (حدود اللہ وغیرہ) بیان کئے گئے ہیں ان کا آغاز بھی اللہ کی صفت رحمانیت ورحیمیت سے کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ حدود تعزیرات کے سخت ترین احکام بھی اس اللہ کی رحمانیت رحیمیت ہی کے مظہر ہیں۔ لہٰذا ان احکام کو ظالمانہ وجابرانہ کہنے کی جسارت وہی شخص کر سکتا ہے جو ایمان وایقان کی دولت سے تہی دامن اور كَانَ الاِنْسَانُ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً۔ کی مکمل تصویر ہو۔

حدود اللہ اور اسلامی تعزیرات کے رحمتِ الٰہیہ ہونے یا جابرانہ اور ظالمانہ سزائیں ہونے کے متعلق ان لوگوں کی شہادت ہی معتبر ہو سکتی ہے جنھوں نے ان کو اپنے ہاں نافذ کر رکھا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں سعودی عرب اور نورستان کا نام لیا جا سکتا ہے کہ ان علاقوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ یہ سزائیں معاشرے کے لئے باعثِ رحمت ہوتی ہیں یا سببِ زحمت۔ اس لئے ایسے لوگوں کی شہادت ہمارے نزدیک مکمل طور پر مسترد ہونے کے قابل ہے، جنہوں نے ان چیزوں کو ایمانی طور پر تو کجا تجرباتی طور پر بھی ابھی تک نافذ نہیں کیا۔ ہم ان لوگوں کی شہادت مسترد کرتے ہیں کہ یہ شاہدِ عادل کی شہادت نہیں ہے۔

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

ایجاد بدعت کا دوسرا نام "شریعت سازی"

ایک دور تھا جب انسان ستر پوشی کے لئے درختوں کے پتوں کا محتاج تھا، مگر اب اس قدر مختلف انواع واقسام اور گوناگوں رنگوں اور ڈیزائنوں کے کپڑے اور ملبوسات معرضِ وجود میں آ چکے ہیں کہ انہیں حیطۂ شمار میں لانا مشکل ہے۔ پہلے انسان ضروریاتِ شکم کے لئے قدرتی پیداوار پر اکتفا کرتا تھا، مگر اب قدرتی پیداوار میں اس قدر دخل انداز ہو چکا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بہت سی اشیاء اپنی مرضی کے مطابق اگاتا ہے بلکہ ان میں ایسے ایسے فنکارانہ تصرفات بھی کرتا ہے کہ ان کی اصل حقیقت پہچاننی مشکل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ پہلے وقتوں میں انسان پیدل سفر کیا کرتا تھا، پھر اس نے گدھوں، گھوڑوں، اونٹوں اور دیگر حیوانات کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اب ایسی ایسی سواریاں ایجاد کر چکا ہے کہ جن پر مہینوں کا سفر گھنٹوں میں، ہفتوں کا سفر منٹوں میں اور دنوں کا سفر سیکنڈوں میں طے کر لیا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب سورج کے غروب ہوتے ہی زمین، ایک ظلمت خانے میں تبدیل ہو جاتی تھی، پھر انسان دیا، لالٹین، شمع وغیرہ بنا کر رات کی تاریکی کا مقابلہ کرتا رہا مگر اب اس نے بجلی، برقی رو کو دریافت کر کے گویا سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر لیا ہے اور پھر انہیں ایسے ایسے بلبوں، ٹیوبوں اور دیگر بڑے بڑے طاقتور قسم کے قمقموں میں بند کر رکھا ہے۔ جنہیں رات کے وقت کسی مقام پر نصب کر دیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دن طلوع ہو گیا ہو۔ کبھی وقت تھا جب انسان کی آواز اسی حد تک دور جا سکتی تھی جس حد تک اس کے گلے اور حلق میں قوت ہوتی تھی مگر آج لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹی۔ وی، اور دیگر ایجادات کے ذریعے اس کی آواز ایک شہر سے دوسرے شہر تک یا ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہی نہیں بلکہ پورے کرۂ ارضی پر گونج رہی ہے۔

یہاں ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ سائنسی ایجادات واکتشافات کی طویل فہرست پیش کی جائے،بلکہ ہمارا مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ آج خرابۂ زمین میں جو آبادی اور ویرانۂ کائنات میں جو شادابی نظر آ رہی ہے یہ سراسر اس خود کار اور ہمہ وقت مصروف، چھوٹی سی مشینری کی مرہونِ منت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دونوں کندھوں کے درمیان، گردن کے اوپر نصب کر رکھی ہے۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن فکری، عملی، تخلیقی اور دیگر صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ شاید کسی اور مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں۔ اور پھر اس بات میں بھی کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں جو جو قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں وہ اسے اس وقت بھی معلوم تھیں جب آدم کتمانِ عدم سے ابھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا اور اس وقت بھی معلوم تھیں جب آدم کو وجود سے نوازا گیا اور اس وقت بھی معلوم تھیں جب اسے خود شکن اور خود نگر، کائنات شکن اور کائنات ساز بنا کر اس ویرانۂ کائنات میں اتارا گیا۔ اور اسے پوری نوع انسانی کا نمائندہ قرار دے کر اس سے فرمایا گیا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدىً فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَايَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔

"یعنی تمہارے پاس میری طرف سے یقیناً ہدایت آئے گی۔ سو جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا وہ نہ ضلالت وگمراہی کا شکار ہو گا اور نہ شقاوت میں مبتلا ہو گا۔"

انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کو اور مذکورہ بالا آیت کریمہ کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ آدم کو زمین پر بھیجتے ہوئے اور اسے خلافتِ ارضی عطا کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ تم میری دی ہوئی صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال کر کے علم اور سائنس کے ذریعے نت نئی ایجادات کر سکتے ہو۔ زمین سے اپنی مرضی کے مطابق پیداوار حاصل کر سکتے ہو۔ ایک سے ایک بڑھ کر خطرناک ترین ہتھیار تیار کر سکتے ہو۔ غرض تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ کائنات شکنی کر

سکتے ہو، کائنات سازی کر سکتے ہو ــــ مگر ــــ دین سازی اور شریعت سازی ــــ یہ تمہارے بس کا کام نہیں، تمہارے لئے جائز نہیں بلکہ تمہارے لئے مناسب ہی نہیں۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تمہاری دنیا اس سے سدھر سکے گی اور نہ آخرت سنور سکے گی، نہ دنیا کی مشکلات حل کر پاؤ گے اور نہ آخرت کے مصائب سے نجات حاصل کر سکو گے۔

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔

یعنی ہر دین سازی، گمراہی ہے اور ہر گمراہی (انجام کار) آگ میں (لے جانے والی) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین وہدایت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى - فرما کر خود اپنے اوپر ڈال لی اور پھر انسانوں میں سلسلۂ نبوت ورسالت جاری فرما کر اپنی اس ذمہ داری کو پورا کر دیا۔

اور پھر جس طرح اس کائنات کی اکثر وبیشتر اشیاء بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزرتی ہیں اسی طرح جب انسانیت ان مراحل سے گزرتے ہوئے عقل وشعور کے لحاظ سے بلوغت اور جوانی کی منزل تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ انبیاءؑ ورسلؐ کی آخری کڑی یعنی دانائے سبل، ختم الرسل، خاتم النبیین، رحمتہ للعالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر سلسلۂ نبوت ورسالت کو بھی مکمل کر دیا اور ان پر دین وہدایت کی بھی تکمیل فرما دی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب وسنت کی شکل میں دین وہدایت کا جو سرمایہ ہمیں عنایت کر دیا گیا ہے وہ اس قدر جامع، اس قدر کامل اور اس قدر واضح وسہل ہے کہ اب ہمیں نہ کسی نئی نبوت ورسالت کی ضرورت ہے اور نہ کسی نئے دین وہدایت کی۔

بدعات نوازی عقیدۂ ختم نبوت سے متصادم ہے

اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ اگر ایک مسلمان سلسلۂ نبوت

و رسالت کے ختم ہو جانے کو بھی مانتا ہے اور دین کے مکمل ہو جانے کو بھی برحق جانتا ہے اور پھر ساتھ ساتھ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے طویل عرصہ بعد ظہور پذیر ہونے والے چند امور کو بہت بڑی دینی حیثیت بھی دیتا ہے بلکہ انہیں ایمان و کفر اور دینداری و بے دینی کا معیار قرار دیتا ہے تو ایسا شخص جہاں لاعلمی میں اللہ و رسول ؐ کی تکذیب کرتا ہے وہاں غیر شعوری طور پر ان کی توہین و بے ادبی کا مرتکب بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے عمل سے گویا یہ ثابت کرتا ہے کہ ختمِ نبوت اور تکمیلِ دین کی جو خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دی ہے وہ درست نہیں اور دینِ اسلام اپنی تکمیل میں میری دینی اختراعات اور شریعت سازی کی کدو کاوش کا محتاج ہے۔ جب تک میرے تجویز کردہ اضافے اس میں شامل نہیں کئے جائیں گے اس وقت تک دینِ اسلام اس قابل نہیں ہو گا کہ اسے دینِ کامل کہا جا سکے۔

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں، حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کے متعلق اسلام کوئی نہ کوئی ہدایت اور رہنمائی نہ دیتا ہو۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنی زندگی میں خود ساختہ دین کے بعض احکام داخل کر لیتا ہے تو جس حد تک وہ احکام اس نے اپنی زندگی میں داخل کئے ہوتے ہیں، اسی حد تک اس کی زندگی سے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کے احکام خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خود ساختہ احکامِ دینی اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام دینی باہم مختلف اور متضاد ہوتے ہیں اور دو باہم متضاد اشیاء کا بیک وقت ایک مقام پر مجتمع ہونا بلاشک وشبہ خلافِ دین و دانش اور خلافِ عقل و منطق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ خود ساختہ دین کے احکام کو یکے بعد دیگرے اپنانا شروع کر دیتا ہے تو وہ دین آہستہ آہستہ اس کی زندگی کی تمام وسعتوں پر چھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حقیقی و اصلی دین اپنی جگہ پر سمٹنا شروع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے

جب وہ سمٹتے سمٹتے اپنا بوریا بستر ہی سمیٹ لیتا اور اس کی زندگی سے بالکل ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج کئی ایسے فرقے اور گروہ دنیا میں موجود ہیں جو کہلاتے تو اسلامی فرقے ہیں مگر ان کے افکار ونظریات اور اعمال وکردار کو دیکھا اور پرکھا جائے تو وہاں اصل اسلام کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنی تمام تر زندگی خود ساختہ دین کے حوالے کرنے کے بعد حقیقی واصلی دین کو اپنی زندگی سے دیس نکالا دے چکے ہیں۔

دین سازی کا کام کرنے والے حضرات خود تو جانتے ہوتے ہیں کہ انہوں نے کہاں کہاں دین سازی کے "جوہر" دکھائے ہیں، کس کس مقام پر اپنی "تخلیقی" صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور کس کس مسئلے کو دین کا لبادہ پہنا کر اسے دینی اور شرعی حیثیت دے چکے ہیں۔ مگر بعد میں آنے والی نسلیں دین سازی کی تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر ان لوگوں کے "خود ساختہ دینی مسائل" ہی کو حقیقی و اصلی دین سمجھ لیتی ہیں، انہی کی تبلیغ اور نشرواشاعت کرتی ہیں، انہی کی تعلیم دیتی ہیں اور انہی پر مرمٹنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر شیعہ مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض ان فرقوں اور ان کی شاخوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو اپنے مخصوص اور خود ساختہ عقائد ونظریات کی بنا پر کسی درخت کی شاخِ بُریدہ کی طرح دینِ حقیقی کے اصول وارکان اور بنیادوں سے اس قدر دور جا چکے ہیں کہ اب ان کا دینِ حقیقی کے اس اصلی درخت کے ساتھ کوئی تعلق ہی معلوم نہیں ہوتا جس کی وہ شاخیں ہیں۔ زنجیر زنی، سینہ کوبی، گریباں چاک کرنا، سیاہ رنگ کا لباس زیبِ تن کر لینا، صدیوں پہلے شہادت کے مقامِ بلند پر فائز ہونے والوں پر یوں ماتم کا مظاہرہ کرنا جیسے یہ ابھی کل ہی کا واقعہ ہو، حج وعمرہ کی بہ نسبت ایران وعراق کے "مقاماتِ مقدسہ" کی زیارت کو زیادہ اہمیت دینا، اسلافِ امت کے ممنونِ احسان ہونے کے بجائے ان پر لعن طعن کرنا، ان کے لئے رحمت اور مغفرت کی دعاؤں کے بجائے انہیں

گالیوں کے "تحفے" ارسال کرنا اور اسی طرح کے مزید چند ایک امور کی پابندی کرنا۔

یہ ہیں وہ چند "خود ساختہ مسائل" جنہیں بعض لوگ منزّل من اللہ دین سمجھ کر اپنائے ہوئے ہیں، اور جنہیں دنیا جہان کے تمام کاموں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا رب ان سے راضی ہو جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان چیزوں کا نشان تک نہیں ملتا بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر امور کے متعلق صریح ممانعت کے احکام ملتے ہیں۔

اسی طرح اہلِ سنت کی طرف نسبت رکھنے والے بعض حضرات ہیں جنہوں نے شادی و مرگ کی چند رسوم ہی کو اصلی دین اور حقیقی شریعت سمجھ رکھا ہے۔ ان کو ایمان اور اسلام کے اصول و ارکان سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی پابندی نہ کرنے والوں کو کافر، گستاخ، بے دین اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات بھی اظہر من الشّمس ہے کہ ان رسوم کو معرضِ وجود میں آئے ابھی چند سال کا عرصہ ہی ہوا ہے۔

اسی طرح تقلیدِ شخصی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ بھی اس دنیا سے رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحلت سے کئی سو سال بعد معرضِ وجود میں آیا۔ صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے دور میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ مگر متاخرین میں سے بعض حضرات نے اس کو اتنی اہمیت دی کہ اسے کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل قرار دے دیا، اب ظاہر بات ہے کہ یہ بھی دین سازی اور دین میں اختراع پسندی ہی کی ایک شکل ہے۔

یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ خود ساختہ دینی مسائل کی کوئی لمبی چوڑی فہرست پیش کی جائے بلکہ ہمارے پیشِ نظر صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر دین سازی کا دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی جائے اور ایسا کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے حوصلہ افزائی کی جائے تو دین حقیقی کی

عمارت کی تمام اینٹیں ایک ایک کر کے گرتی چلی جائیں گی حتیٰ کہ ایک وقت آ سکتا ہے جب عمارت کا صرف نام یا نشان باقی رہ جائے گا۔ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی خطرات کو پیشِ نظر رکھ کر درجِ ذیل فرمودات اپنی زبانِ وحی ترجمان سے ارشاد فرمائے تھے۔

عَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ ۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا)

ترجمہ:۔ جس شخص نے کسی شریعت سازی کرنے والے، دین میں اضافہ کرنے والے کی عزت وتوقیر کی اس نے بلاشک اسلام (کی عمارت) کو ڈھا دینے میں (اس کی) اعانت کی۔

عَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ (رواہ احمد)

ترجمہ:۔ کوئی قوم نئی شریعت (بدعت) ایجاد نہیں کرتی مگر اس کے برابر اصلی شریعت (سنت) ان کے اندر سے اٹھالی جاتی ہے۔ تو پرانی اور اصلی شریعت کو مضبوطی سے تھام لینا نئی شریعت ایجاد کرنے سے (بہرحال) بہتر ہے۔

عَنْ حَسَّانَ قَالَ مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (رواہ الدارمی)

ترجمہ:۔ حسان نے کہا، کوئی قوم اپنے دین میں نئی شریعت (بدعت) ایجاد نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ اس کے برابر ان کی اصلی اور پرانی شریعت (سنت) کا حصہ ان سے سلب کر لیتا ہے۔ پھر قیامت تک اسے ان کی طرف واپس نہیں لوٹاتا۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ (متفق علیہ)

ترجمہ:۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! جس شخص نے ہمارے اس امر (یعنی دین اسلام) میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ چیز مردود ہے۔ (قابل قبول نہیں ہے)

آخری حدیث میں خط کشیدہ الفاظ کو پیش نظر رکھا جائے تو اس مسئلہ کے متعلق پیدا ہونے والے اشکالات اور پیدا کئے جانے والے مغالطے از خود ختم ہو جاتے ہیں۔فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا ۔کا مفہوم یہ ہے کہ "دین" کے اندر کسی چیز کو ایجاد کرنا قابل مذمت ہے۔ "دنیا" کے اندر کسی نئی چیز کا پیدا کرنا قابل مذمت نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے اندر نئی نئی چیزیں معرضِ وجود میں آتی ہی رہتی ہیں اور آتی ہی رہیں گی، سائنس دان نئی نئی چیزیں دریافت اور ایجاد کرتے ہی رہتے ہیں اور کرتے ہی رہیں گے۔ ان پر کوئی قدغن، کوئی پابندی نہیں۔ البتہ دین کے اندر نئی نئی چیزوں کا اضافہ ناپسندیدہ اور قابلِ مذمت فعل ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ہماری زندگی کو دو شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) عبادات۔ اس شعبے کے متعلق اسلام کا بتایا ہوا اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ عبادات صرف وہی جائز اور درست ہیں جنہیں قرآن وحدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی عبادت وضع کی جائے گی تو وہ "شریعت سازی" (بدعت) شمار ہو گی۔ مختصر یہ کہ قرآن وحدیث میں بیان کردہ عبادات کے علاوہ باقی تمام عبادات ناجائز اور حرام ہیں۔ (۲) معاملات۔ اس شعبے کے متعلق اسلام کا اصول اور قانون یہ ہے کہ معاملات صرف وہی ناجائز اور حرام ہیں جن کے متعلق قرآن وحدیث میں ممانعت کر دی گئی ہو۔ باقی تمام معاملات درست اور جائز ہیں۔ گویا جس طرح کسی عبادت کے جائز ہونے کے لئے قرآن وحدیث کی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، منع ہونے کے لئے نہیں، اسی طرح کسی معاملے کے ناجائز ہونے کے لئے قرآن وحدیث کی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جائز ہونے کے لئے نہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
(اقبال)

ذکر اللہ
کی اہمیت، فضیلت اور فلسفہ

گلشنِ اسلام کی سیر کرتے ہوئے انسان کی بہت سے پھولوں پر نظر پڑتی ہے۔ ہر پھول جاذبِ نظر، ہر پھول دل کش، ہر پھول زینتِ چمن، ہر پھول باعثِ وقارِ گلشن۔ مگر "ذکر اللہ" کی شان سب سے نرالی ہے، اس پھول کو پورے چمن میں کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ظاہر کو دیکھو تو اس کی خوشبو سب سے جدا، اس کا رنگ سب سے الگ اور سب پہ غالب۔ اس کے باطن کو دیکھنے کی کوشش کرو تو اس کی جڑیں تمام گلشن میں پھیلی ہوئیں، ہر پھول اندر ہی اندر اس سے متصل اور اس سے متمتع اور مستفید نظر آئے گا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں۔ کہ بعض پھولوں کی زندگی اسی پھول کے وجود کی مرہونِ منت ہے۔ یہ ہے، تو وہ موجود۔ یہ نہیں تو وہ معدوم۔

نماز کے عظیم عبادت ہونے میں کون شک کر سکتا ہے! نماز انسان کو بے حیائی کے کاموں سے اور برائیوں سے روکتی ہے۔ اس کی عظمت، اس کی فضیلت، اس کی اہمیت بہت سی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے ثابت ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نماز عبادت کی کامل ترین شکل ہے، تو اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ مگر جب "ذکرُ اللہ" سے خالی ہو جاتی ہے، تو نماز نماز نہیں رہتی ، پڑھنے والے کے لئے نفاق کی علامت بن جاتی ہے، اس کے لئے باعثِ ثواب و برکت ہونے کے بجائے سببِ عذاب و لعنت بن جاتی ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔
(العنکبوت۔ ۴۵)

ترجمہ:۔ "بے شک نماز فواحش و منکرات سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے"

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یُرَاءُوْنَ النَّاسَ وَلَایَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ۔ (النساء ۔ ۱۴۲)

ترجمہ:۔ "وہ (منافقین) سستی اور ریاکاری سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں"

تِلْکَ صَلٰوۃُ الْمُنَافِقِ یَجْلِسُ یَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰی اِذَا اصْفَرَّتْ وَکَانَ بَیْنَ قَرْنَیِ الشَّیْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبعًا لَایَذْکُرُ اللّٰہَ فِیْھَا اِلَّا قَلِیْلًا ۔(مسلم)

ترجمہ:۔ "یہ منافق کی نماز ہے کہ وہ بیٹھا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ زرد اور شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو وہ تیزی کے ساتھ اٹھ کر چار ٹھونگیں (کوے کی طرح) مارتا ہے اور اس میں اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتا ہے"

زکوٰۃ کی اہمیت وفضیلت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا. قرآن وحدیث میں اکثر مقامات پر نماز کے ساتھ اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کا انکار کرنے والوں پر خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تلوار اٹھالی تھی ۔ مگر اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے خالی ہو تو زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں رہتی ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت نیت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی اللہ کے ذکر کی ایک صورت ہے۔ اور پھر زکوٰۃ وصول کرنے والے کو حکم ہے کہ اس کی وصولی کے وقت ادا کرنے والوں کے حق میں کلمۂ خیر کہے اور ان کے لئے اللہ سے اس کی رحمت وبخشش کی دعا کرے۔ یہ بھی اللہ کے ذکر کی ایک شکل ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ ۔ (التوبہ ۔ ۱۰۳)

حج اور عمرہ جیسی عظیم اور طویل عبادت پر غور کرو۔ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ۔ سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔

بیت اللہ کے طواف. سعی بین الصفا والمروۃ. منیٰ اور میدانِ عرفات کے قیام سے ہوتے ہوئے بیت اللہ کے طوافِ وداع پر اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ان تمام افعالِ حجّ وعمرہ میں کوئی بھی ایسا فعل نہیں جو ذکرُ اللہ سے خالی ہو۔ بلکہ میدانِ

عرفات سے واپسی پر المشعر الحرام کے نزدیک پہنچ کر اور مناسکِ حج سے فراغت کے بعد خصوصی طور پر ذکرُ اللہ کا اور استغفار و دعا کا حکم دیا گیا ہے۔

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّيْنَ ۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللهَ ، اِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُ وا اللهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْاَشَدَّ ذِكْراً ۔
(البقرہ۔ ۱۹۸ تا ۲۰۰)

روزوں کے احکام بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان کے متعلق ارشاد فرمایا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ (البقرۃ ۱۸۵)

ترجمہ:۔ ”رمضان وہ مہینہ ہے۔ جس میں قرآن نازل کیا گیا“

یہاں قرآن کے متعلق محض یہ خبر دے دینا مقصود نہیں ہے، کہ فلاں مہینہ میں نازل کیا گیا۔ بلکہ یہ بات سمجھانی مقصود ہے، کہ چونکہ قرآن مجید ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا ہے، اس لئے اس مہینہ میں اس کی بہت زیادہ تلاوت ہونی چاہئے۔ اور تلاوتِ قرآن مجید بھی ”ذکرُ اللہ“ ہی کی ایک شکل ہے۔ اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رمضان سے متعلقہ معمولات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات مزید کھل کر سامنے آ جائے گی کہ رمضان کے روزوں کا اور ذکرُ اللہ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

انسان اگر روزے کے دوران قدم قدم پر شدید طبعی تقاضے اور ضرورت کے باوجود روزے کے منافی افعال اور اس کو توڑنے والی اشیاء سے دامن بچا بچا کر چلتا ہے۔ تو صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کی وجہ سے۔

اسلام کی چار بنیادوں کے ساتھ ”ذکرُ اللہ“ کا تعلق واضح ہو چکا۔ باقی رہ گئی پانچویں بنیاد تو وہ ہے ”لاالٰہ الا اللہ“ اور ”محمدٌ رّسولُ اللہ“ کی گواہی۔ اس کے

متعلق تو اتنا ہی کافی ہے، کہ اس کا نصف حصہ تو ہے ہی سراپا اللہ کا ذکر. بلکہ افضل الذکر۔ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے. تو اس سے سب سے پہلے اسی پانچویں بنیاد کا اقرار کرایا جاتا ہے. اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک کوئی غیر مسلم اللہ کا ذکر نہ کرے، اس کے لب پر اس کے نام کا ترانہ جاری نہ ہو. تب تک وہ اسلام کی عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اسے مسلمان کہلانے کا حق پہنچتا ہے۔

گزشتہ گفتگو سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے۔ کہ "ذکرُ اللہ" کا نماز. زکوٰۃ. حج. صیامِ رمضان اور شہادتین کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ اور چونکہ یہ پانچ چیزیں اسلام کی بنیادیں ہیں اس لئے ان کی وساطت سے اسلام کی تمام عمارت کے ساتھ "ذکرُ اللہ" کا تعلق جڑ جاتا ہے۔ اور پھر چونکہ اسلام کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہیں. اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام زندگی "ذکرُ اللہ" سے عبارت ہو جاتی ہے۔ سونے سے قبل بھی اللہ کا ذکر اور بیداری کے بعد بھی اس کا ذکر. قضائے حاجت سے قبل بھی اس کا ذکر اور بعد بھی اس کا ذکر. وضو سے قبل بھی اس کا ذکر، بعد میں بھی اس کا ذکر. اذان اور نماز تو ہے ہی سراپا "ذکر اللہ"، نماز سے فراغت کے بعد بھی اللہ کا ذکر. گھر سے نکلتے ہوئے بھی داخل ہوتے ہوئے بھی اس کا ذکر. سفر پر روانہ ہوتے وقت بھی اور واپس ہوتے ہوئے بھی. چڑھائی چڑھتے ہوئے بھی اور اترائی اترتے ہوئے بھی. صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی، کھانے پینے سے پہلے بھی اس کا ذکر اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر بھی اس کا ذکر۔ اگر انسان تجارت کرتا ہے. تو وہ بھی اسے ذکرُ اللہ سے غافل نہیں کرنے پاتی۔ حکومت ملتی ہے تو اس میں بھی ذکرُ اللہ سے غافل نہیں ہو جاتا. مصیبت آتی ہے. تو صبر کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور خوشی نصیب ہوتی ہے تو شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کے ذکر سے زبان کو تر رکھتا ہے. معاشرتی ذمہ داریوں میں پڑتا ہے تو بھی اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ دو زندگیوں کو جب آپس میں جوڑنے کا مرحلہ آتا ہے، تو اس کا آغاز

خطبۃُ النکاح سے ہوتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔ جب فریضۂ زوجیّت ادا کرنے کے لئے اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے، تو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے۔ اور جب کوئی نئی روح اس کار زارِ حیات میں قدم رکھتی ہے، تو سب سے پہلے اس کے کانوں میں اذان کہی جاتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔ اور جب کوئی مسلمان معرکۂ حیات سے فارغ ہو کر اگلی دنیا کی طرف سفر شروع کرتا ہے، تو اللہ کے ذکر ہی کے ساتھ اسے "الوداع" کہا جاتا ہے۔ اس کی نمازِ "جنازہ" پڑھی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے رحمت و مغفرت کی دعائیں کی جاتی ہیں ـــــ الغرض! انسانی زندگی کا گوشہ گوشہ "ذکرُ اللہ" کے سورج کی روشنی سے منوّر ہو جاتا ہے۔ اور گلستانِ حیات کا پتّا پتّا، بوٹا بوٹا اس پھول کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔

جہاد اور ذِکرُ اللہ

میدانِ جہاد، جہاں معرکۂ ایمان و کفر برپا ہوتا ہے، جہاں ہر شخص اپنے دشمن کو مارنے اور اس کے ہاتھوں مرنے کے لئے تیار ہو کر آتا ہے، جہاں گولیاں برستی ہیں۔ جہاں سینے چھلنی ہوتے ہیں، جہاں اپنی جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں، جہاں تمام عزیز و اقارب، اولاد اور والدین تک کو انسان بھول جاتا ہے۔ وہاں بھی اللہ کو بھول جانے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ وہاں کثرت سے اللہ کو یاد کرنے کا حکم ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَالَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللہَ کَثِیْراً لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (الانفال۔ ۴۵)

ترجمہ:ـــ اے اہلِ ایمان! جب تمہاری (دشمنوں کی) کسی جماعت سے مُڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ ـــــ گویا ذکرُ اللہ کی کثرت، دعوت دین کی جدوجہد اور قتال و جہاد میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

تجارت و معاشرت اور ذِکرُ اللہ

تجارت انسان کا بہت وقت مانگتی ہے۔ اس کی مکمّل توجہ طلب کرتی ہے۔

انسان اگر اپنی پوری صلاحیتوں سے کام نہ لے تو تجارت میں کامیابی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اسی طرح معاشرتی ذمہ داریاں اٹھانا اور پھر ان کو نباہنا بھی خاصا محنت طلب کام ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اگر انسان اللہ سے غافل ہو جاتا ہے تو اس کا سودا خسارے کا سودا ہے۔ اس کی تجارت اس کے لئے نفع بخش نہیں ہو سکے گی۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُلْهِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ ۔ (المنافقون۔ ۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں ذکرُ اللہ سے غافل نہ کر دیں اور جو لوگ ایسا کر بیٹھیں پس وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں"

رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللهِ ۔ (النور۔ ۳۷)

دل کی زندگی اور ذکرُ اللہ

انسان کو "ذکرُ اللہ" کی کثرت کی عادت ڈالنی چاہئے۔ جس طرح انسان جسم کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ اسی طرح دل کی زندگی کے لئے انسان کو ذکرُ اللہ کی ضرورت ہے۔ جو اللہ کا ذکر کرتا ہے، اس کا دل زندہ اور جو نہیں کرتا ہے اس کا دل مردہ ہوتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِیْ لَایَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ ۔ (بخاری و مسلم)

اللہ کی خصوصی رحمت اور ذکرُ اللہ

اس لئے بھی اللہ کے ذکر کی عادت ڈالنی چاہئے، کہ اس کے سبب سے انسان پر اللہ کی خاص رحمت کی بارش ہوتی ہے. فرشتوں کی ہم نشینی کی سعادت حاصل ہوتی ہے. اللہ کی طرف سے سکینت و طمانیت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو ان لوگوں میں یاد کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔

لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللهَ اِلَّاحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِکَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ ۔ (رواہ مسلم)

اللہ تعالیٰ کا جوابی ذکر

جب انسان کسی دوسرے انسان کو یاد کرتا ہے تو وہ دوسرا کبھی اس کو یاد کرتا ہے کبھی نہیں کرتا، مگر اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ بھی اسے یاد کرے۔ اگر وہ اسے نہیں یاد کرتا تو اس کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی غیر یقینی صورتِ حال کو اپنے اس وعدے سے ختم فرما دیا ہے کہ "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"۔ اگر مجلس میں یاد کرو گے تو میں بھی تمہیں مجلس میں یاد کروں گا اور اگر تنہائی میں یاد کرو گے تو میں بھی تمہیں تنہائی میں یاد کروں گا"

فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ ۔ (البقرہ۔ ۱۵۲)

اور حدیثِ رسول ہے:

فَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفْسِه ذَكَرْتُهُ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَكَرْتُهُ فِیْ مَلَاءٍ خَيْرٍ مِّنْهُمْ ۔ (بخاری و مسلم)

کتنا خوش بخت ہے وہ خاکی انسان جس کا ذکر خود اس کا خالق تنہائی میں اور نورانیوں کی محفل میں کرتا ہو!

دانشِ نورانی اور ذکرُ اللہ

اس لئے بھی ہمیں اللہ کے ذکر کو اپنی عادت بنانا چاہیئے، کہ اس کی وجہ سے انسان کو اللہ کی نظر رحمت اور خصوصی توجہ اور نورانی فرشتوں کی صحبت ومعیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چوں کہ "نورُ السمٰوات والارض" ہے، اور فرشتے نورانی مخلوق ہیں، اس لئے اللہ کی توجہ اور فرشتوں کی صحبت ومعیّت سے انسان کے اندر ایک قسم کا روحانی نور اور باطنی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روشنی اس وقت کام آتی ہے جب شاہراہِ حیات پہ گامزن انسان کے سامنے دفعتاً تاریکی چھا

جاتی ہے۔ اور وہ نہیں معلوم کر پاتا کہ کس طرف جائے۔ ایسے مشکل اور پریشان کُن حالات میں وہ نور باطن جو "ذکرُ اللہ" کی کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے، ان تاریک اور خوفناک راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اور ذاکر کو راہِ راست (صراطِ مستقیم) واضح طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ اور یوں اس کی گو مگو کی کیفیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ پہچان جاتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَالَهُ نُوْراً يَّمْشِيْ بِهِ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهُ فِى الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ (الانعام۔ ۱۲۲)

ترجمہ:۔ "جو شخص مردہ تھا پس ہم نے اسے زندہ کیا اور اسے نور مہیا کر دیا، جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، تو کیا ایسا شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اپنے اندھیروں میں پھنسا ہو جن سے وہ باہر ہی نہ نکل سکے؟"

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ

"مومن کی فراست سے بچو! کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے"

یہ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے۔ لیکن اس کے معنی و مفہوم کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ "ذکرُ اللہ" کی کثرت سے انسان کے اندر دانائی پیدا ہوتی ہے، عقل بڑھتی ہے، فہم و فراست میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور انسان صحیح معنی میں دانشور بن جاتا ہے۔

آج کل ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں الٹی سیدھی باتیں کرنے والوں اور "چوں کہ چنانچہ" کے ذریعے احکام شریعت میں تشکیک پیدا کرتے والوں کو دانا اور دانش ور سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کی نگاہ میں عقل مند اور دانشور وہ لوگ ہیں، جو اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ بیٹھے ہوں، کھڑے ہوں یا لیٹے ہوئے ہوں، کسی حالت میں بھی اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔

اِنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّہَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (آل عمران۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱)

اسی "ذکر اللہ" کی برکت سے ان کی سوچ اور فکر میں درستی اور راستی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ متذکرہ آیات کا آخری حصہ اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ گویا کثرتِ ذکر اصابتِ فکر کی ضامن ہے۔ مومنِ کامل کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا ہے ؎

جو ذِکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فِکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

سکونِ قلبی اور ذکر اللہ

ذکرُ اللہ کی کثرت اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے دل کو سکون واطمینان کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ نعمت ہے، جسے لوگ مال کی فراوانی، عیاشی ونافرمانی، اونچے اونچے مناصب اور عظیم الشان اور خوبصورت محلّات میں تلاش کرتے ہیں مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق ان کی بے سکونی و بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ سکون اور اطمینانِ قلب کا ضامن صرف اور صرف "ذِکرُ اللہ" ہے

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ (الرعد۔ ۲۸)

ذکر اللہ سکونِ قلبی کا سبب کیوں ہے؟

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ اور احادیثِ نبویہ کے پیشِ نظر اس میں تو کوئی شک نہیں رہا کہ "ذکرُ اللہ" سے واقعی دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے، مگر سمجھنے سوچنے کی

بات یہ ہے کہ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ یعنی ذکرُ اللہ سکونِ قلبی وروحانی کا سبب کیوں اور کیسے بنتا ہے؟

ہر چیز کا حقیقی علم تو اللہ ہی کے پاس ہے. تاہم ہمارے خیال کے مطابق اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ چونکہ ہر چیز اللہ کے اختیار اور ملک میں ہے. اس لئے سکون کی دولت بھی مکمل طور پر اسی کے پاس ہے. لہٰذا جس شخص کو وہ اس نعمت سے نوازنا چاہتا ہے. اسے براہِ راست نواز دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے نَزَلَتْ علَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ ۔ کے الفاظ سے یہی مراد ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ذاکر چونکہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت وتوجہ کا مورد ہوتا ہے. جیسا کہ غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ کے الفاظ سے ثابت ہو چکا ہے. اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں سرچشمۂ سکون واطمینان (یعنی اللہ تعالیٰ) کی خصوصی رحمت اور توجہ ہو وہاں سکون واطمینان نہ ہو؟

تیسری وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کی تخلیق اس نہج پر ہوئی ہے کہ وہ ان اسباب وعوارض سے یکسر مبرّا ہیں جو انسانوں کے لئے پریشانی و بے سکونی کا باعث بنتے ہیں. مثلاً کھانے پینے کی فکر. کمانے کی فکر. اولاد کی فکر. زندگی کی فکر. موت کا خوف. مصائب و آلام دنیا. امراض وحوادث وغیرہ۔ اس لئے فرشتے ہمیشہ مکمل طور پر پُرسکون و مُطمئن ہوتے ہیں.

اور اللہ کا ذکر کرنے والوں کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کو فرشتوں کی صحبت ومعیت حاصل ہو جاتی ہے۔ حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ ۔ "فرشتے اہلِ ذکر کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں" ۔ اور ظاہر ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالح ترا طالح کند

چنانچہ فرشتوں کی معیت ومصاحبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ چونکہ وہ خود مکمل طور پر پُرسکون و مُطمئن ہوتے ہیں. اس لئے وہ اپنے ہم صحبتوں اور ہم مجلسوں کو بھی

بِاِذْنِ اللہ سکون واطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔

اِنَّ الَّـذِیْنَ قَالُـوْا رَبُّنَـا اللہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلآئِکَةُ اَنْ لَّاتَخَافُوْا وَلاَتَحْزَنُوْا الآیة (سورہ فصلت۔ ۳۰)

"بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم نہ خوف کھاؤ اور نہ غم"

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللہ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ۔ الآیة۔ (یونس۔ ۶۲ تا ۶۴)

"آگاہ رہو کے یقیناً اولیاء اللہ پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ (یعنی) وہ جو کہ ایمان لائے اور تقوے کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی"

میدانِ جنگ میں ذِکرُ اللہ کا حکم کیوں ہے؟

چونکہ "ذکر اللہ" سے فرشتوں کی صحبت ومعیت حاصل ہوتی ہے، اور ان کی صحبت ومعیت سے سکونِ قلبی حاصل ہوتا ہے، اور سکونِ قلبی سے ثابت قدمی واستقامت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ عام طور پر میدانِ جنگ سے وہی لوگ بھاگتے ہیں جن کے دل پریشان، بے سکون اور خوف زدہ ہوں، اس لئے ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے:

اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللہ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

"جب کسی (دشمن) جماعت سے تمہاری مُڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو! اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو! تاکہ تم فلاح پاؤ"

جنگِ بدر کے سلسلہ میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے بالتصریح بیان فرما دیا ہے کہ اس نے فرشتوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں، لہٰذا تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو! میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا"

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَأُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ۔ (الانفال ۔ ۱۲)

قوت و توانائی اور ذکر اللہ

گویا ذِکرُ اللہ سے دل کی مضبوطی بھی حاصل ہوتی ہے اور جسم کی قوت بھی ۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں ثابت قدمی اس کے بغیر تقریباً ناممکن ہوتی ہے ۔ اس نکتے کی مزید تائید و توضیح کے لئے درجِ ذیل حدیث پر غور فرمایئے:

عَنْ عَلِيٍّؓ اَنَّ فَاطِمَةَؓ اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَشْكُوْ اِلَيْهِ مَا تَلْقٰى فِيْ يَدِهَا مِنَ الرُّحٰى وَبَلَغَهَا اَنَّهُ جَاءَهُ رَقِيْقٌ فَلَمْ تُصَادِفْهُ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَؓ فَلَمَّا جَاءَ اَخْبَرَتْهُ عَائِشَةُؓ قَالَ فَجَاءَنَا وَقَدْ اَخَذْنَا مَضَاجِعَنَا فَذَهَبْنَا نَقُوْمُ فَقَالَ عَلٰى مَكَانِكُمَا فَجَاءَ فَقَعَدَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهَا حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ قَدَمِهِ عَلٰى بَطْنِيْ فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكُمَا عَلٰى خَيْرٍ مِّمَّا سَاَلْتُمَا اِذَا اَخَذْتُمَا مَضْجَعَكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَكَبِّرَا اَرْبَعًا وَّ ثَلَاثِيْنَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمَا مِنْ خَادِمٍ ۔ (بخاری و مسلم)

"حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو ایک دن یہ خبر پہنچی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غلام آئے ہوئے ہیں تو وہ آپ ؐ کی خدمت میں یہ شکایت کرنے کے لئے تشریف لے گئیں کہ (آٹے وغیرہ کی) چکی چلا چلا کر ان کے ہاتھ کو تکلیف ہو جاتی ہے (یعنی چھالے وغیرہ پڑ جاتے ہیں غرض یہ تھی کہ کوئی غلام بطورِ خادم مل جائے گا) لیکن آپ ؐ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تو حضرت فاطمہؓ نے یہی بات حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے ذکر کی (اور واپس آ گئیں) پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (گھر) تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے آپ ؐ کو اس بات کی خبر دی (کہ حضرت فاطمہؓ فلاں غرض کے لئے آئی تھیں۔) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں

تشریف لائے، جب کہ ہم اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے۔ ہم اٹھنے لگے تو فرمایا اپنی اپنی جگہ پہ لیٹے رہو! چنانچہ آپؐ آکر میرے اور فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے درمیان تشریف فرما ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں نے آپ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک اپنے پیٹ پر محسوس کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: جس چیز کا تم نے سوال کیا تھا، کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتا دوں؟ جب تم اپنے بستر پہ چلے جاؤ تو ۳۳ دفعہ سُبحَانَ اللہ ۳۳ دفعہ اَلحَمدُ لِلّٰہ اور ۳۴ دفعہ اللّٰہُ اَکبَر پڑھ لیا کرو! تو یہ تمہارے لئے خادم سے کہیں بہتر ہے"

گویا ذِکرُ اللہ میں ایسی قوت و توانائی ہے جو انسان کی دن بھر کی مشقّت اور تھکاوٹ کے اثرات کو ختم کر سکتی ہے۔

تقریر و گفتگو کی تاثیر اور ذِکرُ اللہ

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ "ذِکرُ اللہ" سے روشنی بھی حاصل ہوتی ہے اور قوت وتوانائی بھی، کیونکہ روشنی اور توانائی عموماً لازم وملزوم ہی ہوتی ہیں۔ اور قوت وتوانائی کا تعلق جس طرح قلب وروح اور تن بدن کے ساتھ ہوتا ہے، اسی طرح خیالات ونظریات کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ذِکرُ اللہ سے افکار وخیالات اور نظریات میں ایسی زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے، جو ایک داعی و مبلغ کے لئے بہت مفید اور ضروری ہے۔

میدانِ جہاد وقتال میں تلوار کی جنگ ہوتی ہے اور میدانِ دعوت وتبلیغ میں افکار کی۔ اس میدان میں مضبوط جسم اور تلوار کی ضرورت ہے اور اس میدان میں مضبوط خیالات وافکار کی۔ جس طرح مضبوط جسم اور تلوار والا کمزور جسم اور تلوار والے کو عام طور پر شکست دے دیتا ہے۔ اسی طرح مضبوط خیالات وافکار والا کمزور خیالات وافکار والے کو اکثر شکست سے دو چار کر دیتا ہے۔ گویا قوت اور مضبوطی بہرحال پسندیدہ چیز ہے، خواہ جسم اور تلوار کی ہو، خواہ خیالات وافکار کی۔

آج سے ایک صدی قبل اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ انسان کے منہ سے نکلنے والی

آوازیں اور اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ و حروف فضاؤں میں بکھر کر معدوم نہیں ہو جاتے، بلکہ وہ اپنے وجود کو قائم رکھتے ہیں اور فضا میں محفوظ رہتے ہیں۔ بلکہ ان کو دوبارہ بعینہٖ پہلے کی طرح بلاکم و کاست سنا بھی جا سکتا ہے۔ تو اس وقت کے لوگ اس کو یقیناً اونچے درجے کا دیوانہ اور احمق قرار دیتے۔ لیکن سائنس نے آج اس بظاہر "دیوانگی و حماقت" نظر آنے والی بات کو ایک حقیقتِ واقعہ ثابت کر دیا ہے۔ بلکہ یہ حقیقتِ واقعہ اب محیّر العقول ترقی یافتہ شکلوں کا روپ دھار چکی ہے۔ اسی طرح ذہنِ انسانی میں جو خیالات ابھرتے ہیں، افکار بنتے ہیں اور رفتہ رفتہ نظریات وعقائد کی صورت اختیار کر جاتے ہیں، یہ بھی حرف وصوت کی طرح ایک حقیقی وجود رکھتے ہیں، ان پر بھی دیگر موجودات کی طرح ضعف وقوت اور نور و ظلمت وغیرہ کے احکام لاگو ہوتے ہیں ـــــ چنانچہ جب کوئی دو انسان مبادلۂ خیال یا کسی خاص موضوع پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں تو اس وقت ان کی آوازیں اور الفاظ وکلمات ہی باہم نہیں ٹکرا رہے ہوتے بلکہ ان کے افکار وخیالات اور نظریات وعقائد بھی خارجی وداخلی دنیا میں موجوں (Waves) کی شکل میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ اس لڑائی کا نتیجہ بھی فتح وشکست کی صورت میں نکلتا ہے۔ فتح کو "تاثیر" اور شکست کو "تاثر" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور فاتح وغالب کو "مُؤثِر" اور مفتوح ومغلوب کو "مُتاثِر" کہا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر ایک داعی ومبلغ یہ چاہتا ہے کہ اس کی زبان اور تقریر میں تاثیر ہو، اس کے افکار ونظریات میں قوت وتوانائی ہو، اس کے مخاطبین وسامعین اس کی تقریر سن کر اپنے غلط عقائد ونظریات سے دست بردار ہو جائیں، تو پھر اس کے لئے اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ "ذکرُ اللہ" کی کثرت کی عادت ڈالے. اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اللہ کا نام وردِ زبان رکھے اور جلوت وخلوت میں اس کی یاد کو حرزِ جاں بنائے۔

شائد اسی حقیقت کے پیشِ نظر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کو یہ حکم دیا گیا تھا۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيَاتِىْ - وَلَاتَنِيَا فِىْ ذِكْرِى - اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى - (طٰہٰ - ۴۲ - ۴۳)

"تم اور تمہارا بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ۔ اور میری یاد اور ذکر میں کوتاہی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ! یقیناً وہ سرکش ہو چکا ہے"

اور شائد اسی وجہ سے رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور آپ ؐ پر ایمان لانے والے ہر شخص کو ابتدائی مکی دور میں ذِکرُ اللہ کا بار بار حکم دیا گیا ہے:

وَاذْكُرِاسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً - (المزمل - ۸)

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلاً - (الدہر - ۲۵)

اور شائد اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں۔

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ (صلى الله عليه وسلم) يَذْكُرُ اللهَ عَلىٰ كُلِّ اَحْيَانِهٖ (مسلم)

"کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے"

گذشتہ صفحات میں ذِکرُ اللہ کے جو فوائد و برکات ذکر کئے گئے ہیں، وہ محض مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہیں ورنہ اس کے اتنے فیوض و برکات ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے اختصار کے پیشِ نظر سلسلۂ گفتگو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

انسانی فکر و کردار کی اصلاح "اللہ اکبر" کی روشنی میں

یہ زمین اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے عظیم الشان پہاڑ اور ہیبت ناک کوہستانی سلسلے، جہاں پہنچ کر انسان اپنے آپ کو انتہائی صغیر و حقیر محسوس کرنے لگ جاتا ہے، یہ خورشیدِ تاباں اور اس کی تیز ترین روشنی و حرارت کہ انسانی آنکھ جسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی اور دیگر اجرامِ فلکی جن کی ضخامت و جسامت کو قریب سے دیکھا جائے تو انسانی عقل دنگ رہ جائے۔ ان تمام کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی معمولی عقل و دانش کا مالک انسان یا کوئی بہت بڑا فلسفی و سائنس دان اس مادی کائنات کا مطالعہ ومشاہدہ کرتا ہے تو اپنے دل کی گہرائیوں میں کائنات کی عظمت وجلالت محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ اور پھر وہ ـــــ جو سعادت مند ہوتے ہیں ـــــ جن کی آنکھوں کی بصارت، دل کی بصیرت کو ساتھ لے کر چلتی ہے ـــــ جن کی دانشِ برہانی، دانشِ نورانی کی فیض یافتہ ہوتی ہے ـــــ وہ کائنات کی عظمت وجلالت کے خیال سے ـــــ اس کے خالق کی عظمت وجلالت اور کبریائی کے تصور تک پہنچ جاتے ہیں، اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ جب یہ کائنات اتنی عظمت وجلالت کی مالک ہے تو خود خالقِ کائنات کتنا عظیم وجلیل اور بارعب ہو گا۔ اور وہ ـــــ جو ان کے برعکس ہوتے ہیں ـــــ وہ اس کے برعکس ہوتے ہیں۔

اللہ کی کبریائی کا تصور اور اسلام

جس طرح یہ مادی کائنات اپنے دیکھنے والے کے دل میں خالقِ کائنات کی عظمت وجلالت کا تصور قائم کر دیتی ہے، اسی طرح خالقِ کائنات کا بھیجا ہوا دینِ اسلام بھی ـــــ جو دینِ فطرت ہے ـــــ اپنے ماننے والے کے دل و دماغ میں خالقِ کائنات کی عظمت و کبریائی کا نقش جما دیتا ہے۔

چنانچہ اس دینِ فطرت کی درجِ ذیل تعلیمات پر غور کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۔

ترجمہ:۔ اے چادر اوڑھنے والے! اٹھ کے (لوگوں کو) ڈرا! اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر! یعنی ''اللہ اکبر'' کہہ دے!

سورۃ المدثر قرآنِ مجید کی اولیں نازل ہونے والی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سب سے پہلا حکم دیا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، اور دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے کمربستہ ہو جائیں، اور پھر اس کے ساتھ ہی متصل جو دوسرا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت اور اس کی کبریائی کا برملا اظہار واعلان کر دیں، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے نزدیک دنیا میں کوئی ایسی طاقت موجود نہیں کہ آپ اس سے خوفزدہ ہو کر دعوت وتبلیغ اور نفاذِ دین کا کام ترک کر دیں گے اور اسکی کبریائی اور بڑائی تسلیم کر لیں گے۔

○ نماز ایک اہم ترین اور افضل ترین عبادت ہے، جس کا چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ ادا کرنا ضروری ہے، اس کی ہر رکعت میں کم از کم پانچ مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر اللہ کی کبریائی اور بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نماز سے فارغ ہو کر سب سے پہلے ''اللہ اکبر'' کہتے اور باقی ذکر اذکار اس کے بعد پڑھتے تھے۔

○ اذان جو دن رات میں پانچ چھ مرتبہ کہی جاتی ہے اور اسلام کا ایک اہم ترین شعار ہے، اس میں بھی تقریباً چھ مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر اللہ کی عظمت وجلالت اور بڑائی کا باآواز بلند اظہار واعلان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نماز باجماعت سے قبل اقامت کہی جاتی ہے تو اس میں بھی تقریباً اذان والے کلمات ہی دہرائے جاتے ہیں۔

○ عید الفطر، عید الاضحیٰ اور حج کے ایام میں بھی سب مسلمان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی پیروی کرتے ہوئے بلند آواز سے

تکبیریں کہتے ہیں اور اس طرح چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے رہتے ہیں تاکہ تکبیریں کہنے اور سننے والے دونوں کے دل و دماغ میں اللہ کی بڑائی جاگزیں ہو جائے۔

○ بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لئے کسی سواری پر سوار ہوتے تو بسم اللہ کہنے کے بعد تین مرتبہ "اَللہ اکبر" کہتے اور پھر اس کے بعد سوار ہونے کی دعا پڑھتے۔ یعنی

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ الخ

○ آپ ؐ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ دورانِ سفر اگر اترائی آتی تو "سُبحان اللہ" کہتے اور چڑھائی آتی تو "اللہ اکبر" کہتے تھے۔

سواری پر سوار ہوتے وقت اور چڑھائی چڑھتے وقت تکبیر کہنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ دونوں مواقع پر مخلوق کی بڑائی کا خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے "اَللہ اکبر" کہہ کر فوراً اس خیال کو جھٹک دیا جاتا ہے اور دل کو خالق کی کبریائی کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔

○ نماز سے فراغت کے بعد ۳۳ مرتبہ "سُبحان اللہ" ۳۳ مرتبہ "اَلحمد للہ" ۳۴ مرتبہ "اَللہ اکبر" پڑھنے کا ذکر بھی احادیث میں آیا ہے۔ اور بعض احادیث میں ۲۵ مرتبہ سبحان اللہ ۲۵ مرتبہ اَلحمد للہ ۲۵ مرتبہ اللہ اکبر اور ۲۵ مرتبہ لاالٰہ الا اللہ پڑھنے کی اجازت بھی آئی ہے۔

○ میدان جنگ میں نعرۂ تکبیر تو مسلمانوں کا ایسا شعار ہے جو کسی سے مخفی نہیں۔ یہی نعرۂ تکبیر مار کر مسلمان اپنے سے کئی گنا بڑی فوجوں پر ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور بحمد اللہ فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی تھی۔

○ دینِ اسلام، دینِ فطرت کی تعلیمات کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے اس کے کان میں اذان کہی جاتی ہے۔ یہ سب سے پہلے اذان کہنے کی تعلیم بھی کیسی عجیب ہے! بچہ سن شعور سے ابھی

منزلوں دور ہے، اس کو گانے بجانے کی شیطانی آواز سے بچا کر اللہ کی کبریائی کا ترانہ سنایا جارہا ہے۔ یہ گویا بچے کے لاشعور کو متاثر کرنے کی ایک کوشش ہے تاکہ جب وہ سنِ شعور کو پہنچے تو اس کا لاشعور اپنے اس تصور اور تاثر کو اس کے شعور کی طرف منتقل کر دے، اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی کا تمام سفر اللہ کی کبریائی کے اسی تصور کے سائے تلے طے ہوتا رہے۔

بچہ اگرچہ باشعور نہیں ہوتا اور اذان کا مفہوم سمجھنے سے یکسر قاصر ہوتا ہے، تاہم اذان کے صوتی تاثر کو ضرور قبول کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے باشعور ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ آج کے جدید دور میں حیوانات تک کے بارے میں تجربات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ مختلف آوازوں کے صوتی تاثر کو قبول کرتے ہیں۔ اس لئے بچے پر پاکیزہ آواز کا پاکیزہ اثر اور بری آواز کا برا اثر مرتب ہونا کوئی ناممکن اور خلاف عقل و دانش بات نہیں۔

درج بالا تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دین اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی بھرپور کوشش ہے کہ ان کے ماننے والے کے قلب و دماغ کی لوح پر اللہ کی بڑائی کا تصور اور اس کی کبریائی کا نقش پوری قوت کے ساتھ مرتسم ہو جائے۔

اللہ کی کبریائی تسلیم کر لینے کے تقاضے

"اللہ سب سے بڑا ہے" یہ لفظِ "اَللہ اکبر" کا مفہوم ہے، جب اللہ سب سے بڑا ہے تو پھر اس کی تمام مخلوق چھوٹی ہے، لہٰذا کبریائی اور بڑائی اللہ ہی کا حق ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو شخص اللہ کے اس حق کو سلب کرنے کی کوشش کرے گا، جہنم رسید ہو گا۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِداً مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ۔

(رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ کبریائی (بڑائی) میری اوپر کی چادر ہے اور عظمت میری نیچے کی چادر ہے. سو جو شخص ان دونوں میں سے کوئی ایک چادر مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا. میں اسے (جہنم کی) آگ میں ڈال دوں گا۔

کبریائی اور عظمت کی چادر چھیننے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی ذات یا اسماء وصفات میں اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ کیونکہ شرک کسی قسم کا بھی ہو. اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کے منافی ہے۔ چنانچہ درجِ ذیل سورۃ الکہف کی آخری آیت میں اس حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۔

ترجمہ:۔ اور کہو (اے پیغمبر!) تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس کی کوئی اولاد نہیں، اور نہ ملک و بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے. اور نہ ذلت سے (بچانے کے لئے) اس کا کوئی دوست ومدد گار ہے. اوراس کی کبریائی خوب بیان کرو۔

اس آیتِ کریمہ نے ایک تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہونے کا عقیدہ رکھنا، کسی مخلوق کو مافوق الاسباب کے طور پر متصرف فی الامور سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسے خیالات رکھنا جن سے اس کی کمزوری اورناتوانی کا تصور ابھرتا ہو. یہ سب نظریات اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بڑائی کے مخالف اور اس کے "اکبر" ہونے کے منافی ہیں۔ دوسرے اس آیت سے بالترتیب. عیسائی. مشرکین مکہ اور یہود تینوں کے شرکیہ عقائد کی تردید ہوتی ہے. کیونکہ عیسائی حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے. مشرکینِ مکہ بہت سارے خود ساختہ معبودوں کو متصرف فی الامور سمجھ کر مشکلات میں ان سے مدد مانگا کرتے تھے اور یہود اللہ تعالیٰ کو فقیر (محتاج) کہا کرتے تھے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۔ (آل عمران)

ترجمہ: یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر (محتاج) ہے اور ہم غنی ہیں۔

نیز یہود کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے درمیان کشتی ہو گئی جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو پچھاڑ دیا۔

چونکہ اس قسم کی تمام باتیں اللہ کی کبریائی کے منافی ہیں، اس لئے آیت کے اختتام پر وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا فرما کر اللہ کی کبریائی خوب بیان کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

پہلا تقاضا

۱۔ اس مختصر سی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کبریائی تسلیم کر لینے کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اس کی توحید پر مکمل ایمان رکھا جائے اور اسکے ساتھ کسی قسم کا شرک کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

دوسرا تقاضا

۲۔ اللہ کی کبریائی تسلیم کر لینے کا دوسرا تقاضا اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا اور برتر نہ سمجھے، کیونکہ اپنے آپ کو بڑا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا، اس کا اظہار کرنا اور حق بات کو ٹھکرا دینا، اصطلاحِ شریعت میں تکبر واستکبار کہلاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ ۔

یعنی تکبر یہ ہے کہ حق بات کو ٹھکرا دیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔

یہ وہ بدترین اخلاقی برائی ہے جس کا ظہور سب سے پہلے ابلیس سے ہوا، اسے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے اپنے آپ کو برتر اور بہتر سمجھتے ہوئے اللہ کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے مردود ہو گیا۔

قرآنِ مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ تمام قوموں کے لئے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کرنے میں جو چیز رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ وہ یہی تکبر واستکبار کا مرضِ خبیث تھا۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ - (المومنون ۔ ۴۶)

یہ بیماری بے شمار مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی برائیوں کا منبع ہے۔ سید سلیمان ندوی ؒ سیرۃ النبی ج ۶ میں لکھتے ہیں:

"ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو۔ جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے، لوگ اسے پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات ونتائج ہزار صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ (ابو داؤد) اور امام غزالیؒ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ "مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں، اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ برابر غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا" یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

تیسرا تقاضا

۳۔ اللہ کی کبریائی کو تسلیم کر لینے کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے اور اسی کا اظہار کرے۔ اس کو تواضع، خاکساری، انکسار اور فروتنی کہتے ہیں۔ یہ تکبر کے برعکس بہت بڑی اخلاقی فضیلت بلکہ بہت سارے اخلاقی فضائل ومحاسن کا سرچشمہ ہے۔ یہ اخلاقی وصف شرعی طور پر ہر ایک سے مطلوب ہے۔ قرآنِ مجید میں اولاد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ محبت ورحمت اور تواضع وخاکساری سے پیش آئے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ۔ (الاسراء)

خود نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے متبع اہلِ ایمان کے ساتھ تواضع اور انکسار سے پیش آئیں.

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (الشعراء)

آپؐ کا ارشاد گرامی ہے: جو شخص بھی اللہ کے لئے تواضع اور فروتنی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی ورفعت عطا کرتا ہے۔ (ترمذی)

آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے: جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری اور تواضع کی بنا پر نہیں پہنتا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو سب کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلّہ پسند کرے اسے پہن لے (ترمذی)

آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تواضع وفروتنی اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے (ابو داؤد)

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع وخاکساری اور دناءت وپستی میں بڑا فرق ہے، تواضع کا منشا یہ ہے کہ انسان میں غرور وتکبر پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے، اور دناءت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض ومقاصد کے لئے انسان اپنی عزت نفس اور خود داری ختم کر ڈالے، تواضع بہت بڑی اخلاقی خوبی ہے۔ جب کہ دناءت وپستی بہت بڑی اخلاقی برائی ہے۔

چوتھا تقاضا

۴۔ اللہ کی کبریائی تسلیم کر لینے کا چوتھا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اطاعت وفرماں برداری کی جائے اور اس کی حاکمیتِ مطلقہ کو تسلیم کیا جائے اور اس کے خلاف بغاوت نہ کی جائے، کیونکہ جو بڑا ہوتا ہے اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور کرنی ہی چاہیے۔

چنانچہ مؤذن جب اذان کہتا ہے تو وہ زبان سے محض عربی کے چند کلمات ہی نہیں نکال رہا ہوتا۔ بلکہ درحقیقت وہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ لوگو! اگر تم اللہ کی کبریائی او بڑائی تسلیم کرتے ہو تو اس کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سب کام چھوڑ کر مسجد میں آ جاؤ! اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر حقِ بندگی ادا کر جاؤ! اور پھر بعد میں بھی اس کے احکام کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو!

اگر کوئی شخص اذان سننے کے باوجود نماز کے لئے نہیں اٹھتا تو اس نے گویا اللہ کو بڑا نہیں سمجھا بلکہ اپنے اس کام کو بڑا سمجھا، جس میں وہ لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنی دکان کو بڑا سمجھا۔ محفلِ احباب اور گپ بازی کو بڑا سمجھا۔ نیند اور آرام کو بڑا سمجھا اور نرم وگرم بستر کو بڑا سمجھا۔ جنہیں وہ اللہ کے لئے چھوڑ نہ سکا۔

اور پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مافوق الاسباب حاکمیت و کبریائی تو زمین، آسمان، چاند، ستارے، سورج، جن وانس، زندیق، کافر، مشرک، مومن غرض تمام کائنات مانتی ہے۔ اور سبھی اس کے تکوینی احکام کے سامنے چار وناچار سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ مگر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس کے تشریعی احکام اور اس کی ماتحت الاسباب حاکمیت کو تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اس میں انسان کو اختیار حاصل ہے۔ چاہے تو تسلیم کر لے اور چاہے تو انکار کر دے۔ اور یہی وہ بات ہے جس سے انسان باقی تمام مخلوقات سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔

ترجمہ۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں بسنے والے تمام اسی (اللہ) کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔ اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی کبریائی اور بڑائی ہے اور وہ غالب ہے۔ حکمت والا ہے۔

دونوں آیات کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ تمام کائنات تکوینی طور پر اللہ کی مطیع وفرماں برادر ہے اور اس کی حاکمیت و کبریائی تسلیم کئے ہوئے ہے، اس لئے اے انسانو! تم اس کی تشریعی حاکمیت و کبریائی کو بھی تسلیم کر لو اور اس کو مکمل طور پر اپنے اوپر نافذ کر دو، تاکہ تمہارے اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور تمہاری زندگی کا سفر خوشگوار طور پر طے ہو سکے۔

پانچواں تقاضا

۵۔ پانچواں تقاضا یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اس لئے اس کا خوف دل میں جاگزیں ہونا چاہئے، اور تمام مخلوق چھوٹی ہے لہٰذا اس کا خوف اول دل میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے، اور اگر پیدا ہو ہی جائے تو اسے استقرار ودوام حاصل نہیں ہونا چاہئے۔

غالباً یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیشِ نظر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کو میدانِ جنگ میں مدت سے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اور جوش وجذبے کے ساتھ بلند آواز سے "اللہ اکبر" کہہ کر اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن سے ٹکرا جایا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کا اللہ سب سے بڑا ہے اور ان کا دشمن اپنے تمام تر جنگی ساز وسامان کے باوجود بڑا نہیں کہ اس سے خوف زدہ ہوا جائے۔

آج مسلمان نے اپنے اسلاف سے قطع تعلق کر لیا ہے، اپنی خودی کی پہچان، اپنے نفس کے عرفان سے محروم اور اپنی طاقت کے اصل راز سے بے خبر ہو چکا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ غیر اللہ کو "سپر طاقتیں" تسلیم کر کے بزدل بن گیا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ "اللہ اکبر" کے الفاظ میں ایسی قوت اور انرجی پنہاں ہے، جس کا مقابلہ ایٹمی انرجی اور طاقت بھی نہیں کر سکتی تو آج اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت نظر آ رہی ہے۔

اپنی زبان سے "اللہ اکبر" (اللہ سب سے بڑا ہے) کا اقرار واعلان کرنا اور پھر اسی زبان سے امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چائنہ وغیرہ کو "سپر طاقتیں"

کہنا بہت بڑی تضاد بیانی ہے۔ دو میں سے ایک کام کرو، یا اللہ کو اکبر (سب سے بڑا) کہنا چھوڑ دو یا روس وامریکہ وغیرہ کو سپر طاقتیں کہنا چھوڑ دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دونوں جملے باہم متعارض اور ایک دوسرے کی نفی کرنے والے ہیں۔ ان دونوں جملوں کا بیک وقت وہی شخص اقرار کر سکتا ہے جو ان کے مفہوم سے نا آشنا ہو اور جسے کچھ معلوم نہ ہو کہ اس کی زبان سے کیا نکل رہا ہے۔ ؎

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہو جن کی جلال تیرا

گزشتہ تفصیلی معروضات سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ "اللہ اکبر" کا جملہ کوئی معمولی جملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔

اس میں انسان کے لئے اصلاحِ عقیدہ ونظریہ کی متاعِ بے بہا بھی موجود ہے اور فکر وکردار کی درستی کا سازوسامان بھی، اس میں بزدلی اور غیر اللہ کا خوف ختم کر دینے کی ضمانت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع وفرماں بردار ہو جانے کی علامت بھی، اللہ کی کبریائی کا اقرار بھی ہے اور اپنی تواضع، عبدیت اور غلامی کا اظہار بھی، یہ تزکیۂ نفس کا تیر بہدف نسخہ، تصفیۂ قلب کا بہترین وِرد ووظیفہ بھی ہے اور دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی باغی حکومتوں کے خلاف زبردست سیاسی وانقلابی نعرہ بھی۔ (موجودہ سیاست اور اس کی نعرہ بازی مراد نہیں کہ اس سے ہم انتہائی ناخوش وبیزار ہیں)

اگر ہم اپنی اولاد کی تربیت کے سلسلے میں ان معانی ومفاہیم کو پیشِ نظر رکھیں اور انہیں اپنی اولاد کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کریں تو یقیناً ہماری اولاد ان تمام اوصاف سے متصف ہو جو اس عظیم کلمے کے مفہوم کے لازمی نتیجے کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری اولاد اور نئی نسل

عقیدہ کے اعتبار سے موحّد، شرک سے مجتنب، کردار وعمل میں صالح اور پاکباز، بزدلی سے نا آشنا، بہادری وشجاعت سے متّصف، تواضع وانکساری سے مزیّن، اللہ ورسولؐ کی وفادار، اپنی خواہشات نفسانی اور لوگوں کی غلامی سے بیزار، قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابند، اسلام دوستوں کی دوست، اسلام دشمنوں کی دشمن، غرض کہ ہراعتبار سے اسلام اور ملک وملت کے لئے مفید اور کار آمد ہوگی۔

مگر افسوس! کہ مسلمان اس لفظ "اللہ اکبر" کے مفہوم سے نا آشنا ہے جو اکثر وبیشتر اس کی زبان سے نکلتا رہتا ہے۔ اے کاش! کوئی ایسا سکول، کالج یا یونیورسٹی ہو جو مسلمان کو اس کی زبان سے صادر ہونے والے کلمات کا مفہوم سمجھا سکے!

اصلاحِ معاشرہ کا سائنٹفک اسلامی طریقِ کار
اصلاح کا عمل کہاں سے شروع کیا جائے؟

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سترہویں صدی میں نیوٹن نے بعض مشاہدات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات میں ہر جسم دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش صرف ہماری زمین تک ہی محدود نہیں، بلکہ سورج چاند اور دوسرے اجرامِ فلکی بھی ایک دوسرے کو ایک خاص قوت سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ زمین پر اجسام کا وزن بھی زمین اور ان اجسام کے درمیان کشش کا نتیجہ ہے۔ اس عالم گیر کشش کو قوتِ مُتجاذِبہ کہتے ہیں اور نیوٹن کے اس نتیجہ کو قانونِ تجاذب (LAW OF GRAVITY) کہتے ہیں۔ اس قانون کے تحت دو اجسام کے فاصلے کا بھی اثر کشش کی قوت پر ہوتا ہے۔ اگر ان میں فاصلہ کم ہو تو کشش کی قوت زیادہ ہوگی۔ اگر فاصلہ زیادہ ہو تو کشش کی قوت کم ہوگی۔

مگر نیوٹن سے کئی صدیاں پہلے یہ نظریہ رومی اپنی مثنوی میں اور دیگر حکمائے اسلام اپنی تصانیف میں بیان کر چکے ہیں۔ تاہم تجاذبِ اجسام یا کششِ ثقل کا مُکتشِف (دریافت کرنے والا) کوئی بھی ہو ہمارے خیال کے مطابق جس طرح یہ مادی کائنات میں جاری وساری ہے۔ اسی طرح تھوڑی سی مختلف صورت میں اعمال وکردار اور خیالات وافکار کی دنیا میں بھی کار فرما ہے۔ ہمارے مشاہدے میں یہ بات اکثر وبیشتر آتی رہتی ہے کہ ایک شخص جب کسی بدی کو اپنا لیتا ہے تو اس کے ساتھ اسے کئی غلط کاریوں کا مزید ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک جھوٹ بولا جائے تو اسے چھپانے کے لئے سَو جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے کہ ایک شخص جب کسی نیکی کا بیڑا اٹھا لیتا ہے تو اس کی طرف بہت ساری نیکیاں اس طرح خود بخود لپکتی چلی آتی ہیں، جس طرح لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ فجر کی نماز با جماعت ادا کر لی جائے تو باقی نمازیں با جماعت ادا کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر فجر کی نماز میں سستی ہو

جائے تو باقی نمازیں بھی انسان کی غفلت اور سستی کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وعلیٰ ہذاالقیاس۔

ایک آدمی اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتا تھا، ایک نوجوان کے متعلق اسے پیغام ملا، اس نے اس نوجوان کے اخلاق وکردار کے بارے میں کسی سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ "ہے تو بہت اچھا انسان مگر کبھی کبھی پیاز کھالیتا ہے، " بڑے تعجب سے اس نے پوچھا: "پیاز کھالیتا ہے، کیا مطلب؟ "میرا مطلب ہے کہ پیاز عام نہیں کھاتا، صرف اس وقت کھاتا ہے جب کبھی شراب پیتا ہے"۔ وہ چونکا، "اس کا مطلب ہے، وہ شراب پیتا ہے؟" "ہاں! وہ شراب بھی عام نہیں پیتا، صرف اس وقت پیتا ہے جب جُوئے میں بازی ہار جائے"۔ اس نے کہا. "اچھا وہ شراب کے ساتھ ساتھ جوئے کا بھی عادی ہے"؟ "ہاں! وہ جُوا بھی عام تو نہیں کھیلتا، صرف اسی وقت کھیلتا ہے جب چوری کا مال اس کے ہاتھ لگ جائے" وہ کہنے لگا. "اچھا وہ چوریاں بھی کرتا ہے؟" "ہاں! ہاں! وہ چوریاں بھی عام تو نہیں کرتا صرف اسی وقت کرتا ہے جب ...... اس طرح اس نے پیاز کھانے کا ذکر کر کے اُس نوجوان کی شخصیت کے بہت سارے پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ سربستہ رازوں سے پردہ اٹھادیا۔

اس مثال کے ذکر سے ہمارا مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جس طرح نیکیوں کا سلسلہ بہت طویل ہے اور وہ سب باہم مربوط و متلازم ہوتی ہیں۔ اسی طرح برائیوں کی زنجیر بھی بہت دراز ہے اور وہ بھی باہم مربوط ولازم وملزوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی انسان ایک نیکی کرتا ہے یا کسی برائی کا مرتکب ہوتا ہے، تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس نے محض ایک نیکی یا برائی کی ہے، بلکہ اس نے تو در حقیقت ایک کڑی کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا ہے جس کے پیچھے نیکیوں یا برائیوں کا ایک طویل سلسلہ ہو گا، اور جب تک وہ خود اس نیکی سے دست کش نہ ہو جائے، یا اس برائی سے توبہ تلا نہ کر لے، یا کوئی اور رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے اس وقت

تک اس سلسلہ کی باقی کڑیاں بھی اس کی طرف خود بخود کھنچتی چلی آئیں گی۔

اور پھر نیکی یا برائی کی کڑی جس قدر بڑی اور ثقیل ہوتی ہے، اسی قدر اس کا سلسلہ بھی بڑا اور طویل ہوتا ہے۔

گناہ کے اثرات و نتائج

اس حقیقت کو مزید مدلل طور پر سمجھنے کے لئے درجِ ذیل امور پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ امام ابنِ تیمیہؒ ، امام ابنِ قیمؒ اور دیگر حکمائے اسلامؒ نے نیکیوں اور برائیوں کے بعض اثرات قرآن وحدیث اور مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں بیان کئے ہیں، جنہیں یہاں نقل کرنا مسئلۂ زیرِ بحث کے سمجھنے میں بہت مفید و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ امام ابنِ قیم "الجواب الکافی" میں رقم طراز ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے اگر وہ توبہ واستغفار کر لے تو اس کا دل پھر روشن ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ میں مزید بڑھتا چلا جائے تو وہ سیاہی پھیل کر سارے دل پر چھا جاتی ہے۔الخ (احمد والترمذی)

(۲) گناہ کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے دل اور جسم میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ دل کی کمزوری تو ظاہر ہے کہ نیک کاموں کی ہمت گھٹتے گھٹتے بالکل ہی معدوم سی ہو جاتی ہے، باقی رہی جسم کی کمزوری تو جسم تو دل کے تابع ہے۔ جب یہ کمزور ہے تو وہ بھی کمزور ہو گا۔ غور کیجئے کہ فارس وروم کے کفّار کتنے قوی الجثہ تھے مگر صحابۂ کرامؓ کے مقابلہ میں ان کے قدم ذرا بھی جم نہ سکے۔ جب دل پر گناہ کی سیاہی چھا جاتی ہے تو اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے، اس کی توانائی جاتی رہتی ہے اور وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ او جب وہ کمزور ہو جاتا ہے تو پھر برائیاں اس پر غالب آ جاتی ہیں۔

(۳) برائی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک برائی دوسری برائی کا سبب ہو جاتی ہے. وہ تیسری کا۔ اس طرح رفتہ رفتہ برائیوں کی کثرت ہوتی جاتی ہے، حتیٰ کہ برائی کا ارتکاب کرنے والا برائیوں میں گھر جاتا ہے۔ برائی اس کی عادت ہو جاتی ہے، جسے ترک کرنا اس کے لئے بہت دشوار بلکہ تکلیف کا باعث ہو جاتا ہے۔ جب ایک برائی دوسری برائی کا سبب بننا شروع ہو جاتی ہے تو پھر ـــ

(۴) برائی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کے دل سے شرم وحیا اور غیرت وحمیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب شرم وحیا ختم ہو جائے تو پھر انسان سے کوئی بھی برائی غیر متوقع نہیں ہوتی۔ ع

بے حیاباش وہرچہ خواہی کن

اِذَالَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ۔

جب انسان پستی کے اس مقام تک آجاتا ہے تو پھر

(۵) برائی کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ چند روز میں انسان کے دل سے برائی کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ برائی اس کی نظروں میں برائی نہیں رہتی، بلکہ اس کا معمول بن جاتی ہے۔ پہلے جس برائی کو چھپ چھپا کر کرتا تھا اب اسے علی الاعلان کرنے لگ جاتا ہے۔ پہلے جس پر ندامت اور پشیمانی ہوتی تھی،اب اس پر فخر ومسرت کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جب انسان کی یہ کیفیت ہو جائے تو پھر اس کے متعلق شدید خطرہ ہے کہ کہیں کافر ومرتد اور زندیق وملحد نہ ہو جائے۔ کیوں کہ اس کا ایمان واسلام کفروالحاد کی سرحدوں کو چھو رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ ـــ

(۶) برائی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جب برائی کسی انسان کی عادت اور معمول بن جائے، اس کی فطرت مسخ ہو جائے، اس کے قلب میں زَیغ، اس کی سوچ میں کجی پیدا ہو جائے، نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی سمجھنے لگ جائے تو پھر اس کے بعد اس کی اگلی منزل یہی ہوتی ہے کہ وہ کفروالحاد کے کھڈ میں گر جائے یا از خود چھلانگ لگا

دے۔ قرآنِ مجید میں بھی بعض مقامات پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان پر جو اللہ کی طرف سے ذلت ومسکنت مسلط کر دی گئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ناحق قتل کرتے تھے۔ اور اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قتل تک نوبت کیوں پہنچی؟ کیونکہ وہ اللہ کی نافرمانی اور اس کی حدوں سے تجاوز کرنے لگ گئے تھے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الخ (البقرہ: ۶۱)

گویا اس آیت میں بنی اسرائیل پر ذلت ومسکنت کے مسلط ہونے کا سبب ان کے کفر اور قتلِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قرار دیا گیا ہے۔اور ان کے کفر وقتلِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سبب ان کے عصیان اور اعتداء کو ٹھہرایا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کے ارتکاب. برائیوں میں استغراق اور مسلسل پیش رفت سے افراد اور اقوام بعض اوقات کفر والحاد تک پہنچ جاتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح کرتے چلیں کہ گناہ اور بدی کے مذکورۃ الصدر اثرات ونتائج کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی شخص کی ذات پر سب کے سب یک دم ظاہر اور مترتب ہوتے چلے جائیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو بلکہ کچھ اثرات ونتائج اس کی ذات پر مترتب ہوں اور کچھ اس کی اولاد اور آئندہ پیدا ہونے والی نسل میں ظاہر ہوں۔ کیونکہ جس طرح نیکی کے اثرات وبرکات انسان کی اولاد تک پہنچ جاتی ہیں اسی طرح برائی کے اثرات وعواقب بھی پشت درپشت منتقل ہوجایا کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے حالات اور تاریخِ اسلام کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس اصول کی حقانیت وواقعیت مزید کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کل اسلامی ممالک میں الحاد وزندیقیت. کمیونزم وسوشلزم اور دیگر بے دین فلسفوں کا جو سیلاب امڈا ہوا ہے اور کثیر تعداد میں مسلمانوں کی نئی پود اس کی لپیٹ میں آرہی ہے تو اس کا

سبب بھی دراصل یہی ہے کہ ہماری پرانی نسل نے برائی کی مخالفت میں اپنے وہ فرائض ادا نہ کئے جو اس پر عائد ہوتے تھے۔ برائی کو روکنے کے بجائے اسے برداشت کرتے رہے، برداشت کرتے کرتے خود بھی اس میں مبتلا ہونے لگے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی پشتوں سے برآمد ہونے والی نئی نسل کفر وارتداد اور دہریت والحاد کی علمبردار بن گئی۔

(۷) برائی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نیکی کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے اس سے نیکیاں چھوٹتی چلی جاتی ہیں۔ آج ایک نیکی گئی، کل دوسری، پرسوں تیسری، حتیٰ کہ ایک دن وہ اکثر وبیشتر بلکہ تمام نیکیوں سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جس طرح نماز برائیوں سے روکتی ہے اسی طرح بعض اوقات برائیاں بھی نماز سے روکتی ہیں۔(دیکھئے احیاء علوم الدین ج ا ؎)

نیکی کے اثرات ونتائج

برائی کی طرح نیکی کے بھی بے شمار اثرات ونتائج ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک کے بیان پر ہم اکتفاء کریں گے۔

(۱) نیکی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو مزید نیکیوں کی توفیق اور بہت سی برائیوں سے بچنے کی قوت عطا ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ کی کثرت سے انسان کے لئے تقریباً تمام شرعی احکام پہ عمل پیرا ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی:

اِنَّ شَرَائِعَ الاِسْلَامِ قَدْ کَثُرَتْ عَلَیَّ فَاَخْبِرْنِیْ بِشَیْءٍ اَتَشَبَّثُ بِہٖ

کہ شرعی احکام اور نیکی کے کام تو میرے سامنے بے شمار ہیں۔آپ مجھے کسی ایک ہی (جامع) چیز کا حکم دے دیں جسے میں مضبوطی سے تھام لوں! آپؐ نے فرمایا

لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِّنْ ذِکْرِ اللہِ ۔

(کوشش کرو کہ) تمہاری زبان ہمیشہ ذکر اللہ سے تر رہے۔ (ترمذی۔ ابنِ ماجہ)

نماز کے متعلق قرآن مجید میں یہ صراحت موجود ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔ کہ نماز فواحش و منکرات سے روکتی ٹوکتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک صحابی کو بہت سے نیک اعمال بتا کر دریافت فرمایا: کیا میں تمہیں یہ نہ بتا دوں کہ ان تمام اعمال (کا جامع اور ان) کو استحکام بخشنے والا کون سا عمل ہے؟ صحابی نے عرض کی. کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتایئے! آپؐ نے زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: اس کو اپنے قابو میں رکھو! الخ (احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

گویا زبان کو قابو میں رکھنے سے بہت سے نیک کام آسان اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی برائیوں سے بچنے کا سازو سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نظر وغیرہ کو قابو میں رکھنے سے بھی بہت سے نیک اعمال میسر ہو جاتے ہیں اور بہت سی برائیوں اور پراگندہ خیالیوں سے انسان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

(۲) نیکی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان بغیر کسی مشقت و وقت کے اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔ اور اگر کسی مصیبت و پریشانی میں گرفتار ہو تو بآسانی اس سے چھوٹنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جاتی ہے

وَمَنْ یَّتَّقِ اللہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔

جب کہ بہت سے لوگوں کو پریشانیوں سے چھٹکارا اور اپنے مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنا پڑ جاتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی۔ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی۔ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی۔ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی۔ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی۔

ترجمہ : جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور الحسنٰی (توحید اور بھلائی کی بات) کی تصدیق کی تو ہم اسے آسان (جنت اور نیکیوں کے) راستے کی سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اللہ تعالیٰ سے) بے نیازی برتی اور الحسنٰی (توحید، بھلائی کی بات) کی تکذیب کی تو ہم اسے سخت مشکل (جہنم اور برائیوں کے) راستے کی سہولت دیں گے۔ (اللیل: ۵ تا ۱۰)

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان اگر تین نیکیاں (اعطائے مال، تقویٰ اور تصدیق بالحسنٰی) اپنا لے تو اس کے لئے باقی نیکیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں اور برائیوں کا ارتکاب اس کے لئے مشکل تر ہو جاتا ہے۔ اور اگر تین برائیاں (بخل، اللہ تعالیٰ سے استغناء اور تکذیب بالحسنٰی) اختیار کر لے، تو اس کے لئے دیگر برائیاں آسان ہو جاتی ہیں اور نیکیاں اس کے لئے آہستہ آہستہ دشوار تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

نیک اور بُرے اعمال کی باہم درجہ بندی و تفاضل

قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اَشیاءِ کائنات میں باہم درجہ بندی اور تفاضل پایا جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی اور برائی کے کاموں میں بھی یہ سلسلہ موجود ہے۔ بعض نیکیاں سب سے افضل بعض بہت فضیلت والی اور بعض صرف فضیلت والی ہوتی ہیں۔ اسی طرح برائی کے کاموں میں بھی بعض سب سے بُرے (بدترین) بعض بہت بُرے (بدتر) اور بعض صرف بُرے (بد) ہوتے ہیں۔ اسی طرح حالات اور مقامات کے تغیر سے بھی بعض اوقات نیکیوں اور برائیوں کے درجات میں فرق پڑ جاتا ہے۔

توحید و ایمان اور شرک و کفر میں کششِ ثقل

چوں کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے، جو نیک عمل جس قدر بڑا اور فضیلت و اہمیت والا ہو گا اسی قدر وزنی اور ثقیل ہو گا اور جو برائی جس قدر بَڑی اور بُری ہو گی اسی قدر بھاری اور گراں ہو گی۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ جس

نیکی میں سب سے زیادہ وزن اور ثقل پایا جاتا ہے. اس میں کششِ ثقل یعنی دیگر نیکیوں کو اپنی طرف کھینچ لانے کی صلاحیت بھی سب سے زیادہ ہو گی۔ بشرطیکہ کوئی مانع پیدا نہ ہو جائے۔ اسی طرح جو برائی سب سے زیادہ ثقل والی ہو گی اسی قدر اس میں کششِ ثقل یعنی دیگر برائیوں کو اپنی طرف کھینچ لانے کی قوت بھی زیادہ ہو گی۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صدق دل سے گواہی دے اور ان پر ایمان رکھے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ

"سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی: یارب مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دے جس کے ساتھ میں تجھے یاد کرتا اور پکارتا رہوں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا! لا الٰہ الا اللہ کہا کرو! حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی: یا اللہ! یہ تو تیرے تمام ہی بندے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر تمام زمین و آسمان اور ان میں بسنے والی تمام مخلوقات کو (ترازو کے) ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے میں لا الٰہ الا اللہ کو رکھ دیا جائے تو لا الٰہ الا اللہ والا پلڑا بھاری ہو گا اور وہ نیچے جھک جائے گا۔ (ابن حبان، الحاکم)

اسی طرح رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے:

اَکْبَرُ الْکَبَائِرِ الشِّرْکُ بِاللهِ

یعنی سب گناہوں سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔

مذکورۃ الصدر احادیث ونصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرنا سب سے بڑی اور سب سے قوی نیکی ہے. بلکہ تمام نیکیوں کی

بنیاد اور جڑ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا سب سے بڑی اور قوی برائی ہے بلکہ تمام برائیوں کی اصل اور اساس ہے۔ توحید کی کششِ ثقل کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے ماننے والے کے اندر تمام نیکیاں خود بخود کھنچی چلی آئیں۔ وہ انفرادی طور پر بھی اچھا ہو، اجتماعی طور پر بھی اچھا ہو، اس کا ظاہر بھی اچھا ہو، اسکا باطن بھی اچھا ہو، اس کا کردار بھی اچھا ہو، اس کی گفتار بھی اچھی ہو۔ اس کے اخلاق بھی اچھے ہوں، اس کے معاملات بھی اچھے ہوں۔ الغرض وہ رزم ہو یا بزم ہو ہر حالت میں پاک دل اور پاکباز ہو۔

اسی طرح شرک کی کششِ ثقل کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے ماننے والے میں تمام قسم کی برائیاں موجود ہوں، وہ زانی بھی ہو، شرابی بھی ہو۔ چور بھی ہو، قاتل بھی ہو۔ بداخلاق بھی ہو، بدکردار بھی ہو، الغرض اس کی شخصیت برائیوں کا ایک مجموعہ ہو۔[۱]

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ مشاہدہ تو اس بات کی تکذیب کرتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ کتنے ہی مشرک ہیں جن میں شرک کے ساتھ ساتھ بعض اوصافِ حمیدہ بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً سخی ہوتے ہیں، غریب سے

۱۔ اس نکتے پر غور کرتے ہوئے یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ سورۂ نور کی آیت اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَایَنْکِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ۔
سے اور اسی طرح شرک کے مراکز پر ہونے والے جرائم اغواء، فحاشی، منشیات فروشی وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک اور ان مذکورہ جرائم کے مابین کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور ہے، جس کی وجہ سے قرآنِ مجید میں بھی ان کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے اور واقعات کی دنیا میں بھی اکثر وبیشتر اکٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی مناسبت باہمی کو اس مضمون میں "کششِ ثقل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہمدردی کرتے ہیں، چوری، شراب جوئے وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی موحّد ہیں جو توحید سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ بعض گناہوں میں مبتلا بھی ہوتے ہیں۔ اگر توحید و شرک میں وہ صلاحیت وقوت ہوتی جو تم بیان کر رہے ہو تو صورت حال اس طرح نہ ہوتی جس طرح کہ نظر آرہی ہے۔

مگر یہ خیال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اگر زمین میں کششِ ثقل موجود ہے تو پھر چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے پنکھے اور بلب وغیرہ زمین کی طرف کھنچ کر کیوں نہیں آجاتے؟ ظاہر بات ہے کہ پنکھے وغیرہ کو چھت سے معلق کر کے زمین کی کششِ ثقل کو ان پر اثر انداز ہونے سے عارضی طور پر روک دیا گیا ہے۔ جوں ہی ان کو چھت کی قید سے آزاد کر دیا جائے گا، فوراً زمین کی قوتِ کشش ان پر اثرانداز ہوگی اور وہ دھڑام سے زمین پر آگریں گے۔

اسی طرح انسان کی نفسانی خواہشات بعض اوقات اتنی طاقت ور ہو جاتی ہیں کہ توحید کی قوتِ کشش عارضی طور پر غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ اور وہ موحد انسان کئی نیکی کے کاموں سے متّصِف نہیں ہو پاتا۔ بلکہ کئی برائیوں کا ارتکاب بھی اس سے ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح بعض اوقات اچھا ماحول اور انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہوا نیکی کا جذبہ واحساس بعض اوقات شرک کی کششِ ثقل کو عارضی طور پر غیر مؤثر بنا دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مشرک انسان کئی برائیوں کے ارتکاب سے قاصر بھی رہتا ہے اور بعض نیکیاں بھی اس سے سرزد ہو جاتی ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اعمال و کردار اور خیالات وافکار کی دنیا میں بھی کششِ ثقل کا قانون جاری و ساری ہے تو پھر ـــــ

ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ صالح قسم کا معاشرہ ہو، سب لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں، سب کی جان، مال اور عزت محفوظ ہو۔ اس میں بدکاری نہ ہو، چوری نہ ہو، ڈاکے نہ ہوں۔ رشوت ستانی نہ ہو، الغرض نیکی کی فراوانی اور حکمرانی ہو اور برائی مغلوب ومحکوم ہو تو پھر اس کا طبعی، سائنٹیفک اور نبوی طریق یہ ہے کہ معاشرے میں توحید کی دعوت کو (اصل اور جامع شکل میں)

ترین اور ثقیل ترین نیکی ہے اور شرک و بد اخلاقی کی پوری طاقت کے ساتھ تردید کی جائے، اس کے دلائل کو توڑا جائے، اس کے مظاہر و معابد کو مسمار کر دیا جائے۔ کیونکہ شرک تمام برائیوں کی بنیاد اور سب سے قوی ترین اور ثقیل ترین برائی ہے۔ ثقیل ترین نیکی جب معاشرے میں جاگزیں ہو جائے گی تو پھر تمام نیکیاں اس کی قوت اور کششِ ثقل کی بنا پر خود بخود اس کی طرف کھنچتی چلی آئیں گی۔ اور اسی طرح ثقیل ترین برائی جب معاشرے سے رخصت ہو گی تو تمام برائیاں اس کی کششِ ثقل کی بنا پر اس کے ساتھ ہی رخصت ہوتی چلی جائیں گی۔

قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دعوتِ دین میں یہی طریقِ کار رہا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوموں میں آکر سب سے پہلے اللہ کی توحید، اپنی رسالت اور اخلاقِ حسنہ کی دعوت دیتے اور شرک اور بداخلاقی کی تردید اور نفی کرتے۔ جو لوگ توحید و رسالت پر ایمان لے آتے اور شرک کی تردید و نفی کو قبول کر لیتے، تو وہ آہستہ آہستہ تمام نیکیوں سے متصف اور تمام برائیوں سے دور ہوتے چلے جاتے تھے۔

آخر میں وہ افراد، وہ جماعتیں اور وہ حکومتیں اور ممالک جو اصلاحِ معاشرہ کے لئے دن رات کوشاں ہیں، اور اسلامی حکومت، اسلامی معاشرت اور اسلامی طرزِ حیات کے شدید متمنی ہیں، ان کی خدمت میں ہماری انتہائی دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ کبھی اپنے طریق کار کے متعلق غور کرنا گوارا کر لیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا طریقِ کار غیر فطری غیر سائنٹیفک اور غیر نبوی ہے، جس کی وجہ سے نتائج ان کی توقع اور امید کے مطابق بر آمد نہیں ہو رہے۔

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی!
کیں راہ کہ تومی روی بترکستان ست

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ وَمَا تَوۡفِيۡقِيۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ
(ھود-۸۸)

دعوت و اصلاح

کے چند

اہم اصول

قرآن و سنت کی روشنی میں

از نعیم الحق نعیم

دار الدعوة السلفية لاهور

ناشر

رضیہ شریف ٹرسٹ

۴۴۶-شادمان کالونی لاہور